مولوی عبدالحق
چند ہم عصر
انجمن ترقی اردو ہند

بابائے اردو

مولوی عبدالحق

انجمن ترقّی اُردو (ہند) نئی دِلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۴۱۶ء

سنہ اشاعت : ـــــــــ ۱۹۹۱ء
اشاعت : ـــــــــ پندرھویں
قیمت : ـــــــــ انیس روپے 19
بہ اہتمام : ـــــــــ شمیم جہاں
تزئین کار : ـــــــــ انیس احمد
طباعت : ـــــــــ ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دلّی

ISBN 81 - 7160 - 036 - 0

BOOK DEPOT BRANCH:
ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
2ND FLOOR, URDU BHAWAN,
CHOWHATTA PATNA-800 004.

Head Office:
ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR, ROUSE AVENUE,
NEW DELHI - 110 002

فہرست مضامین

منشی امیر احمد صاحب مرحوم

۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد صاحب مینائی ہندستان کے سربرآوردہ اور نہایت ممتاز شعراء میں سے خیال کئے جاتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے حال ہی میں حیدرآباد میں انتقال فرمایا ہے، لہٰذا ان کے حالات جہاں تک دستیاب ہو سکے، یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

آپ کے والد کا نام مولوی کریم محمد تھا۔ حضرت مخدوم شاہ مینا جن کا مزار شریف لکھنؤ میں ہے، آپ کے سلسلۂ اجداد میں سے تھے، خود شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کی، اس لئے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ البتہ ان کے بھائی کے اولاد ہوئی چنانچہ منشی صاحب مرحوم کو بھی ان ہی کی اولاد میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے، عربی فارسی کی معمولی کتابیں علمائے وقت کی خدمت میں پڑھیں، علاوہ اس کے طب، جفر، نجوم وغیرہ میں بھی مہارت بہم پہنچائی مگر ذوق شعر گوئی غالب تھا۔ تدبیر الدولہ مظفر الملک منشی سید مظفر علی خاں بہادر اسیرؔ امیٹھوی امین صدر امانت نصیر الدین حیدر شاہ و میر منشی امجد علی شاہ و واجد علی شاہ سے تلمذ اختیار کیا۔ اور اس رنگ کی شاعری کو اپنے استاد سے زیادہ فروغ دیا۔ بلاشبہ منشی صاحب مرحوم فخر اسیرؔ تھے۔

منشی صاحب سلطانِ عالم حضرت واجد علی شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے۔ اس باریابی کی وجہ غالباً ان کی دو کتابیں ارشاد السلطان و ہدایۃ السلطان ہوئیں، یہ دو کتابیں آج کل کہیں نہیں ملتیں، اور نہ یہ پتہ ملتا ہے کہ ان میں لکھا گیا ہے۔ غالباً بادشاہ کی کتابوں کی شرحیں۔ واجد علی شاہ کی یہ عادت عجیب تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور اِدھر اُدھر سے چند کتابیں اٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لئے، اسی طرح جو کتاب سامنے آئی اس میں سے کچھ حصّہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر دیئے ہیں غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز ان کے درباری ان کتابوں کو اعلیٰ تصانیف میں سے خیال کرتے تھے، ایسی ان مل بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا اور ان میں ربط و سلسلہ قائم کرنا منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا۔ وہ تا انتزاعِ سلطنت وہیں رہے۔

غدر کے بعد ماہِ رمضان ۱۲۷۵ھ میں بعہد فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں بہادر تخلص ناظم ریاست رام پور میں تشریف لائے۔ نواب نے بڑی قدردانی اور اعزاز کیا۔ سنا ہے کہ ابتداءً نواب ایک صاحب بیمار تخلص کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ بعد ازاں مرزا نوشہ غالبؔ سے اصلاح لینا شروع کی اور ایک مدت تک ان ہی کو اپنا کلام دکھایا اسی زمانے میں منشی صاحب سے مشورہ فرماتے رہے۔ چنانچہ نواب صاحب کی واسوختوں نیز بعض دیگر نظموں سے منشی صاحب کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ شروع شروع میں ایک عرصہ تک منشی صاحب رامپور میں محکمۂ عدالت دیوانی کے مفتی رہے اور یہی وجہ ہے کہ مفتی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر کے زمانے میں نظارات مطبخ خاص پائگاہ سرکاری میر اخباری، مصاحبی وغیرہ کے مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔

نواب صاحب نے منشی صاحب کو ہی اپنی استادی کے لئے انتخاب فرمایا اور ان کی مزید شہرت کا ایک بڑا سبب نواب صاحب کا تلمذ بھی تھا۔

منشی صاحب کی شاعری

منشی صاحب امیرؔ کے شاگرد تھے اور امیرؔ کو مصحفی سے تلمذ تھا۔ مصحفی، آتشؔ، ناسخؔ، امیرؔ خواجہ وزیرؔ اور منشی صاحب ایک طبقے یعنی قریب قریب ایک رنگ کے شاعر ہیں۔ مصحفی بہت مشکل پسند تھے اکثر سنگلاخ زمینوں میں کہتے اور کھینچ تان کے حق استادی ادا کرتے اسی سے اکثر شعر ان کے بے مزہ رہے مگر ان کا صاف کلام بھی بہت کچھ ہے۔ ناسخؔ بلاشبہ ایک اچھے اور پاکیزہ طرز کے ناسخ اور ایک بھونڈے طرز کے موجد ہیں ان کے کلام میں نہ نمکینی نہ شیرینی ہے نہ زبان کا لطف ہے نہ مضمون کا۔ خواجہ وزیرؔ ان سے بھی دو ہاتھ بڑھے ہوئے ہیں۔ اس طبقہ کے اولین میں سے آتشؔ اور آخرین میں سے امیرؔ بہت غنیمت ہیں۔ یعنی باوجود اس قسم کی شاعری کے صفائی سے کام لیا ہے اور اس کے لئے ان کے بعض اشعار بہت صاف اور عمدہ نکل گئے ہیں۔ منشی صاحب کا اخیر کلام اور بھی زیادہ صاف ہو گیا ہے اور بھونڈے استعارات کے نمونے بہت کم نظر آتے ہیں۔ ہم یہاں ان کے چند شعر نقل کرتے مگر چونکہ ان کا کلام بے انتہا مشہور ہو چکا ہے اور ان کے دیوان قریباً ہر شوقین کے پاس موجود ہیں اس لئے ضرورت نہ سمجھی گئی۔ علاوہ اس کے منشی صاحب مرحوم اردو شاعری کی موجودہ تمام اصناف پر قادر تھے۔ قصائد بلند اور پُر زور ہیں۔ ترجیع بند، ترکیب بند، واسوخت وغیرہ سب اپنی طرز پر اچھے لکھے ہیں مگر رباعیات پھیکی ہیں۔ نعت میں منشی صاحب کے کئی رسالے ہیں مثلاً محامد خاتم النبیین، ذکر شاہ انبیاء، صبح ازل، شام ابد ان کی مشہور نعتیہ نظمیں ہیں۔ محامد خاتم النبیین خصوصاً بہت مقبول ہوئی اور بار بار چھپی۔ نعت کا جو طرز ہمارے اکثر شعراء نے اختیار کیا ہے وہ بہت قابل اصلاح ہے، ہمارے یہاں شاعری کی بنا غزل پر سمجھی گئی ہے، جو ایک لحاظ سے کمترین قسم شعر کی ہے اس لئے تغزل کا رنگ کچھ ایسا جما ہے کہ ہر جگہ جا و بے جا اسی کی جھلک نظر آتی ہے، بھلا نعت میں زلف و کمر، خال و خط وغیرہ سے کیا تعلق۔ مانا کہ یہ بھی سہی مگر یہ کیسی غضب

کی بات ہے کہ جو مقصد نعت کا ہے اور جو نعت کی جان ہے وہ بالکل غائب۔ گو بعض اوقات منشی صاحب بھی اسی ڈھرے پر چلے ہیں مگر انہوں نے بہت اعتدال سے کام لیا ہے۔ غالبًا مولانا حالی کا رنگ آئندہ شاعری پر بہت کچھ اثر ڈالے گا اور ہماری شاعری کے بہت سے عیوب کو پاک کر دے گا۔ حق یہ ہے کہ جسے نعت دیکھنی ہو وہ مولانا حالی کی نعت دیکھے۔ نعت میں وہی ذکر ہونا چاہیئے جو خدا کے نبی کے لئے شایان ہے اور جس کے پڑھنے اور سنانے سے لوگوں پر روحانی اور اخلاقی اثر پڑے اور معلوم ہو کہ کمال بشریت اسے کہتے ہیں، نہ یہ کہ تمام نعتیہ قصائد سننے کے بعد دل پر یہ اثر ہو کہ کسی شاہد رعنا، خوش اندام، نازک بدن حسین کی تعریف ہے۔

بہر حال منشی صاحب کا نعتیہ کلام بہت غنیمت ہے گو وہ اس اعلیٰ رتبہ کا نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہیئے مگر اس قسم کے نعتیہ کلاموں میں بہت قابلِ تعریف ہے۔ منشی صاحب کی شاعری پر بحیثیتِ مجموعی اگر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تمام فنون سے جو کلام موزوں کرنے اور شعر کہنے کے لئے ضروری ہیں، پورے ماہر ہیں، بلکہ استادِ کامل ہیں۔ ان کی نظر بہت وسیع ہے مگر بلند نہیں۔ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ جو دائرہ ہمارے شعراء نے اپنی شاعری اور طبیعت کی جولانی کا قرار دیا ہے اسی تنگ دائرہ میں آپ کو وسعتِ نظر حاصل ہے مگر اس سے بڑھ کر قدم نہیں رکھا ہے اور منشی صاحب پر ہی کیا منحصر ہے ہمارے اکثر شعراء کا یہی حال ہے زبان کی تحقیق ضرور ہے مگر بیساختہ پن اور صفائی کم ہے۔ اس قسم کی شاعری کے لئے شوخی بھی ایک ضروری چیز خیال کی گئی ہے مگر وہ داغ پر ختم ہے۔ منشی صاحب کے کلام میں نہیں اور جہاں کہیں کوشش کی ہے شعر پھُس پھُسا ہو کے رہ گیا۔ اہلِ لکھنؤ کے مذاق کے مطابق انھوں نے مضامین باندھنے میں بلند پروازی بھی کی ہے مگر اس میں کچھ ان ہی لوگوں کو مزا آتا ہو گا شاید اس سے زورِ استادی دکھانا مقصود ہوتا ہے نہ کہ زورِ شاعری۔ مگر وہ اپنے خیالات کے اظہار پر پورے قادر ہیں۔ الفاظ کی بندش اور ترکیب ایسی ہوتی ہے کہ کسی حرف گیری کی گنجائش نہیں۔ غرض منشی صاحب کا کلام اپنے رنگ میں اچھا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔

امیراللغات

اب صرف امیراللغات کا ذکر کرنا باقی رہ گیا ہے۔ اس کتاب کو منشی صاحب کا بہت بڑا کام بلکہ سرمایۂ عمر کہنا چاہیئے۔ اردو زبان میں ایک بسیط اور جامع لغت کی بہت ضرورت ہے، اب تک کوئی ایسی کتاب کامل موجود نہیں ہے۔ سوائے دو ایک انگریزوں کی لغات کے جو بہت غنیمت ہیں اور خصوصاً مسٹر فیلنؔ کی ڈکشنری جو قابل تعریف ہے۔ ایک اور لغت بنام فرہنگ آصفیہ مولوی سید احمد صاحب دہلوی ہے جو فی الحقیقت اچھی کتاب ہے مگر اب تک ناتمام ہے، منشی صاحب کی کتاب کی صرف دو جلدیں چھپی ہیں اور ان دونوں میں صرف (الف) کا بیان ہے۔ تیسری جلد جس میں (ب) ہے تیار ہے مگر چھپی نہیں۔ اس کتاب کی تکمیل کے لئے ایک زمانہ اور صرف کثیر درکار تھا۔ افسوس کہ منشی صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ دیکھیے ان کے فرزندوں اور دوستوں میں سے کوئی اس کا بیڑا اٹھاتا ہے یا نہیں۔ اس کتاب کی تالیف کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۸۸۴ء میں جب سر الفرڈ لائل سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی شمالی رامپور تشریف لائے تو انھوں نے نواب کلب علی خاں بہادر سے فرمایا کہ اردو زبان کی ایک جامع لغت اگر آپ کی وساطت سے تیار ہو جائے تو بہت بڑا کام ہو گا۔ نواب صاحب نے منشی صاحب سے فرمایا۔ منشی صاحب کو اس کا پہلے سے ہی خیال تھا جسب الارشاد ۱۸۸۶ء میں لفظ "آنکھ" کے متعلق تمام محاورات وغیرہ لکھ کر نمونتاً لفٹیننٹ بہادر کی خدمت میں روانہ کیئے، لفٹیننٹ گورنر بہادر نے ان اوراق کو پسند فرمایا، اور یہ وعدہ کیا کہ اس میں پوری مدد دی جائے گی اور اس کے لئے بڑا چندہ جمع کیا جائے گا کہ جس سے علاوہ اخراجاتِ طبع مؤلف کی بھی محنت

کا پورا اعمال ہو جائے۔ اور یہ بھی تجویز کی کہ ہمیشہ پہلے چند ورق کے پروف چھپوا کر ملک کے مختلف صوبوں میں بھیجے جایا کریں تاکہ سب لوگوں کو اس پر نکتہ چینی کا اور بحث کرنے کا موقع ملے اور بعد کامل چھان بین کے طبع ہوا کرے، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں سر الفرڈ لائل چلے گئے۔ نواب کلب علی خاں بہادر کا انتقال ہو گیا اور ان تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی، اس کے بعد جنرل عظیم الدین خاں بہادر نے منشی صاحب کو پوری مدد دی اور اس کے اخراجات کے لئے چار سو روپیہ ماہانہ کی منظوری فرمائی، جو ان کے زمانہ تک برابر ملتے رہے مگر افسوس کہ تھوڑی ہی مدت کے بعد وہ جوانمرد بھی ظالموں کے ہاتھ سے شہید ہوا۔ اور یہ مدد بھی اس کے ساتھ ہی موقوف ہو گئی۔ اس زمانہ میں نواب حامد علی خاں بہادر نے کسی قدر رقم اس کتاب کے لئے منظور فرمائی تھی کہ ہزار افسوس کہ خود منشی صاحب رحلت فرما گئے۔

لغت لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی علاوہ عربی فارسی کے سنسکرت یا کم سے کم بھاشا سے بھی بخوبی واقف ہو کیونکہ اردو زبان میں اکثر اسماء و افعال اور تراکیب زیادہ تر سنسکرت کی ہیں، اور جب تک اس زبان سے پوری واقفیت نہ ہو گی اس کی تحقیق کبھی مستند نہیں ہو سکتی علاوہ اس کے کسی ایک یورپین زبان مثلاً فرنچ، انگریزی یا جرمنی سے بھی واقف ہونا ضروری ہے تاکہ لغت کے اعلیٰ نمونے بھی اس کے پیشِ نظر رہیں اور علم اللسان اور تنقید اللسان کا پورا مطالعہ کر سکے حق یہ ہے کہ اب تک جتنی اردو لغات لکھی گئی ہیں ان میں زبان کی تحقیق کا پورا حق ادا نہیں ہوا مگر جو کچھ ہو رہا ہے بہت غنیمت ہے' اور ایک روز اسی مواد سے اعلیٰ درجہ کا کام بھی پیدا ہو جائے گا۔ منشی صاحب نے اپنی لغت میں ذرا طوالت سے کام لیا ہے مثلاً آپ سے بہت بہت امید ہے یا آپ بیڈھب آدمی ہیں یا آپ جانیں آپ کا کام وغیرہ ایسے فقرے ہیں جو الفاظ کا استعمال دکھانے کے لئے تو آ سکتے ہیں لیکن بطور لغت کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے ان فقروں میں آپ کی کوئی تخصیص نہیں یا بعض الفاظ کی تعریف ناقص ہے۔ مثلاً آلو بخارا کے یہ معنی لکھنا کہ ایک قسم کا آلو جو بخارا میں پیدا ہوتا ہے' صحیح نہیں، وہ ہندوستان میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ الفاظ کی تحقیق اور اصل سے بہت کم بحث کی گئی ہے یا بعض الفاظ کے بہت باریک اور لطیف فرق جو قابل بیان تھے رہ گئے ہیں، یہ امر شاید باعث حیرت ہو گا کہ جتنی عمدہ لغات اردو کی اس وقت موجود ہیں یا تو وہ خود انگریزوں کی لکھی ہوئی ہیں، یا ان کی تحریک سے

لکھی گئی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انگریزی کا اثر اردو لٹریچر (ادب) پر بہت اچھا پڑ رہا ہے اور اگر یہی حال رہا تو ایک دن اردو زبان بہت وسیع ہو جائے گی۔ اس وقت جو کام ہو رہا ہے، وہ بالکل ابتدائی ہے اور جو اردو زبان کے لئے اس وقت کام کر رہے ہیں وہ گویا اس کی زبان کو پختہ کر رہے ہیں۔ جس کی پوری قدر آئندہ چل کر معلوم ہوگی۔ غالباً اسی کتاب کے خیال سے منشی صاحب حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام کی فیاضیاں چار دانگ عالم میں مشہور ہیں۔ کچھ عجب نہ تھا کہ منشی صاحب اس میں کامیاب ہو جاتے مگر حیدرآباد آتے ہی بیمار ہو گئے اور بیماری نے اس قدر طول کھینچا کہ ۱۷ رجمادی الثانی ۱۳۱۸ھ شنبہ کے روز وفات پائی۔

قطعِ نظر ادعائے شاعری منشی صاحب مرحوم نہایت بااخلاق اور پاک سیرت آدمی تھے تکبر و عجب نام کو نہ تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے وقار اور متانت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور علاوہ اس کے بہت شگفتہ بیان تھے منشی صاحب مرحوم کی وفات کی بہت سی تاریخیں ہوئیں۔ ہمارے لائق دوست مولوی عبدالجلیل صاحب نعمانی نے بھی ان کی متعدد تاریخیں لکھی ہیں جن میں سے بعض ہم یہاں درج کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب کی تاریخیں ہمیشہ بے تکلف اور واقعات کے عین مناسب ہوتی ہیں ۔ ایک تاریخ تو غریب الوطنی ہے۔ جس کا لطف خصوصاً اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ منشی صاحب کا یہ شعر بھی پیش نظر ہو

اب نہ ٹھہروں گا کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ بلایا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

یہ تاریخ اس قدر عمدہ تھی کہ بعض حضرات نے غصب کر کے اپنے نام سے منسوب کر لی۔ ممکن ہے توارد ہوا ہو جہاں تک ہمیں معلوم ہے سب سے پہلے یہ تاریخ مولوی صاحب نے لکھی ہے۔ ایک اور تاریخ ہوئی ہے۔

وہ استاد نواب خلد آشیاں — ہوا راہی آخرت ناگزیر
کہا مجھ سے رضواں نے سال وصال — کہ خلد آشیاں ہے جناب امیر

دیگر

جس دم کیا امیر نے دنیا سے انتقال | جو منشی و سخنور و مفتی تھا اور فقیہ
اس وقت مجھ سے ہاتفِ غیبی نے یوں کہا | کہہ خاتمہ امیر کا تاریخ فی البدیہہ

۱۳۱۸ھ

دیگر

لوگ کہتے ہیں امیر آئے تھے | ان کو بھائی تھی دکن کی مٹی
یاں پہ آتے ہی حضوری پائی | کیا رسائی تھی دکن کی مٹی
ہوئی اس وصل کی فصلی تاریخ | مرنے لائی تھی دکن کی مٹی

۱۳۱۰ف

پروفیسر مرزا حیرت

سنہ ۱۹۰۰ء

ملٹن اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے کہ شہرت شریف النفس انسان کا آخری ضعف ہے اس سے ہمیں بحث نہیں کہ یہ خیال کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ جنھیں خدا نے غیر معمولی دماغی قوت عطا کی ہے اور جن کا علم وفضل تبحر کے رتبے کو پہنچ گیا ہے ایسے بھی ہیں کہ وہ شہرت پر لات مار کر کنجِ تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں، وہ اپنے فلسفہ اور خیالات میں خواہ وہ بادِ ہوائی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو اس "ضعف" کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو ایک غلام یا بیل اور گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بد مذاقوں کی "ہا ہا" اور چند سمجھ داروں کی "واہ وا" کے لئے کاغذ کو سیاہ اور اپنے لب کو وا کرنا گوارا نہیں کرتے۔

ایسے ہی لوگوں میں سے مرزا حیرت، پروفیسر الفنسٹن کالج بمبئی تھے، جنکے مختصر حالات ہم اس وقت لکھنا چاہتے ہیں۔

وہ صحیح النسب سید تھے مگر تعجب ہے کہ وہ ہمیشہ اسے چھپاتے رہے وہ سنہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے یعنی جس سال کہ ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئیں۔ اُن کا

خاندان ایران میں بہت شریف اور نامور تھا۔ شاہان صفویہ کے زمانے میں سیاسی (پولیٹیکل) انقلابات کچھ ایسے واقع ہوئے کہ اس خاندان کے دو حصے ہو گئے۔ ایک تو اصفہان میں جا کر آباد ہو گیا اور دوسرا طہران میں جا بسا۔ اس خاندان میں کئی شخص علم و فضل اور تدبیر سلطنت میں بہت نامور گزرے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر حیرت کے پردادا مرزا جعفر، کریم خاں بانیٔ خاندان شاہان زند کے وزیر اعظم تھے۔ اور ان کے ایک اور بزرگ عبد الباقی شاعر اور طبیب گزرے ہیں۔ اس زمانے کے مشہور و معروف شاعر معتمد الدولہ المتخلص بہ نشاط ماں کی طرف سے ان کے عزیز ہوتے تھے۔ وہ فتح علی شاہ کے زمانہ میں وزیر امور خارجہ تھے۔

ابھی ان کی عمر چار سال کی ہی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی خورد پرداخت اور پرورش ماں ہی نے کی۔ افسوس ہے کہ ان کی ماں ایک بدمزاج اور مغلوب الغضب اور کم سمجھ عورت تھی اور اگرچہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات بچپن ہی سے ان میں غیر معمولی فراست اور ذہن کے آثار نظر آتے تھے، لیکن وہ زمانہ خوشی سے نہ گزرا۔ چھ سال کی عمر میں انہیں شاہ کجکلاہ کی حضوری میں پیش کیا گیا۔ شاہ اس بچے کی حیرت انگیز دماغی قوت اور خوشخطی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور خوش ہو کر ایک قلمدان اور اشرفیوں کی تھیلی عنایت فرمائی۔ اب یہ بچے سے بڑے ہوئے اور شرافتِ خاندانی اور اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ سترہ سال کی عمر میں صوبہ گیلان کی صوبہ داری (گورنری) نذر کی گئی۔ مرزا حیرت نے اسے قبول نہ کیا۔ کیونکہ ایران میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی اعلیٰ عہدہ کے لئے منتخب کیا جاتا تو اسے شاہی خزانے میں ایک معتد بہ رقم داخل کرنی پڑتی اور جب وہ اپنی جگہ پر قابض ہو جاتا ہے تو خوب ہاتھ رنگتا ہے، اور جتنا دیتا ہے اس سے بیس گنا زیادہ وصول کر لیتا ہے۔ مرزا حیرت کا یہ استغنار اس عمر میں نہایت قابلِ تعریف تھا۔ انہوں نے اس جبر و تعدّی اور اس سلسلۂ ظلم و ستم کو نہایت ناپسند کیا اور ہرگز یہ روا نہ رکھا کہ غریب رعایا کا خون چوس چوس کر اپنے تن و توش کو

پھیلایا جائے۔ افسوس کہ اس سچائی اور ایمانداری کی کچھ قدر نہ ہوئی بلکہ برخلاف اس کے تمام عزیز و اقربا خصوصًا ماں ہاتھ دھو کر مرزا کے پیچھے پڑ گئی۔ دربار شاہی میں بھی وہ وقعت نہ رہی۔ غرض زندگی تلخ ہو گئی اور انہیں مجبورًا وطن مالوف کو خدا حافظ کہہ کر وادئ غربت میں قدم رکھنا پڑا۔ اگرچہ اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی لیکن اس زمانے کے وزرا، داعیان سلطنت، شعرا، مصنفین، علما، و فضلا سے نہایت بے تکلف اور برابر سرابر کا برتاؤ تھا۔ قاآنی جو اس زمانے کا نہایت نامور شاعر ہوا ہے اس سے مرزا حیرت کی بڑی گہری دوستی تھی اور دوسرا مشہور و معروف شاعر یغما اکثر ان کے گھر مہمان رہتا تھا، ایران کو چھوڑ کر انھوں نے ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ کی سیاحت کی۔ کچھ عرصے قسطنطنیہ میں قیام کیا اور فرنچ زبان سیکھی جسے وہ پہلے ایران میں شروع کر چکے تھے۔ علاوہ اس کے وہاں رہ کر یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ اب عرب کے مقدس مقام سنا میں مقیم ہو کر عزت و امن کی گود میں درویشانہ اور صوفیانہ زندگی بسر کریں۔ جب وہ عدن میں پہنچے تو جنگ کریمیا زوروں پر تھی۔ یہ ایک کشتی کے انتظار میں تھے۔ دفع الوقتی کے خیال سے انھوں نے وہاں کی فصیلوں اور قلعوں کو دیکھنا شروع کیا۔ لیکن وہ ایک ایک شے کو اس غور اور گہری نظر سے دیکھ رہے تھے کہ سنتریوں کو شبہ ہوا اور روسی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی زبانوں کے پورے ماہر، جو کچھ انھوں نے کہا کسی نے یقین نہ کیا۔ اور جب یہ بیان کیا کہ میرا ارادہ گوشہ نشینی اور درویشانہ زندگی بسر کرنے کا ہے تو ان کا شبہ اور بڑھ گیا اور انھیں مجبورًا اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور زندگی کے اس نظر فریب پہلو سے بال بال بچ گئے اور بحالتِ نظر بندی انگریزی رجمنٹ کی معیت میں بلگام پہنچائے گئے۔ یہ واقعہ مرزا حیرت کی زندگی میں بڑا انقلاب انگیز ہے۔ نیرنگیٔ تقدیر سے میاں حیرت درویش ہوتے ہوتے ایک روز پروفیسر حیرت ہو گئے۔ وہی نامعلوم اسباب جو انہیں ایک مقدس مقام میں رہبانیت اور عزلت گزینی کے لئے لے چلے تھے کشاں کشاں ایک انگریزی کالج میں لے آئے جس سے نہ صرف الفنسٹن کالج بلکہ تمام بمبئی پریسیڈنسی

کو فخر و عزت حاصل ہوئی۔ یہاں پہنچ کر وہ دو سال تک برابر بحالتِ نظر بندی رہے۔
رجمنٹ کے افسر لوگ ان سے فارسی پڑھنے لگے گویا وہ "منشی" کا کام انجام دیتے تھے۔
مگر اس عرصے میں وہ بھی اس مجبوری کی فرصت کو خوب کام میں لائے یعنی انگریزی
شروع کر دی اور اس خوبی کے ساتھ اسے حاصل کیا کہ بعد میں قابل قابل انگریزوں
کو ان کی انگریزی زبان کی قدرت پر حیرت ہوتی تھی۔ جب اس بندھن سے خلاصی
پائی تو انھوں نے انگریزی ملازمت اختیار کی اور خلیج فارس کے محکمۂ تار میں نوکر
ہو گئے چونکہ اس علاقہ کی زبان سے واقف تھے اس لئے بہت مفید ثابت ہوئے
بعد ازاں گورنمنٹ کے محکمۂ فارسی کے مترجم مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں انھوں نے
گورنمنٹ کی درخواست پر سر جان ملکم کی تاریخ ایران کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ یہ کام
انھوں نے اس لئے شروع کیا تھا کہ اس کی آمدنی سے اپنا قرض ادا کریں۔ مگر حق یہ ہے
کہ کتاب لاجواب ہے بحالیکہ اس کا طرزِ تحریر و خیال انگریزی ہے مگر بحیثیت ایک
فارسی کتاب کے بڑے سے بڑا نقاد بھی حرف گیری نہیں کر سکتا۔ اگرچہ یہ کتاب بہ لحاظ
فصاحت ناسخ التواریخ کو نہیں پہنچتی مگر اس میں شک نہیں کہ ناسخ التواریخ کے
بعد اس زمانے میں کوئی کتاب فارسی زبان میں اس پائے کی نہیں لکھی گئی اور یہ بھی
خیال رکھنا چاہیئے کہ تالیف و ترجمے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ تالیف
و تصنیف میں بہت آزادی ہوتی ہے اور انشاء پردازی اور فصاحت کے جوہر
دکھانے کا موقع حاصل ہوتا ہے اور ترجمہ میں مجبوراً مصنف کے قدم بہ قدم چلنا پڑتا
ہے۔ اس زمانے میں ایران میں جہاں ایک دو مصنف ایسے پیدا ہوئے ہیں جنھوں
نے یہ کوشش کی ہے کہ خالص پارسی زبان لکھی جائے جس میں عربی کا مطلق لگاؤ نہ ہو وہاں کثرت سے
ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو عربی الفاظ اور ترکیبوں کو کثرت سے استعمال کرنے لگے ہیں حتیٰ کہ ایسے
الفاظ اختراع کر لئے ہیں جو عربی زبان میں بھی استعمال نہیں ہوتے یا عربی الفاظ ایسے معنوں میں استعمال
کرنے لگے ہیں جو اصل زبان میں نہیں۔ ان دو کتابوں میں بھی عربیت کا رنگ بہت گہرا ہے۔ تاریخ ملکم میں چونکہ
مترجم کو مصنف کے خیالات کا اظہار اور انگریزی طرزِ تحریر کا نباہ منظور تھا اسلئے عربی الفاظ کا کثرت سے استعمال کرنا ناگزیر تھا۔

اس کتاب کے لئے مترجم کو اپنے ہم وطنوں سے بہت کچھ لعن طعن اور برا بھلا سننا پڑا۔ زیادہ تر اس لئے انھوں نے مصنف کے خیالات حتیٰ کہ ان نقائص کو بھی صحیح صحیح بیان کر دیا ہے۔ ایران میں اگرچہ بحیثیت انشا پردازی کے اس کتاب کی بہت تعریف ہوئی مگر پہلے پہل اس سے سخت مخالفت اور نفرت کی گئی مگر اب وہ تعصب بہت کم ہو گیا بلکہ جاتا رہا۔ اگرچہ یہ کتاب صرف ایک ترجمہ ہے لیکن دنیا میں اس نامور فاضل کی ایک یادگار رہے گی جو اس سے بہتر اور اعلیٰ یادگار قائم کر سکتا تھا۔ مگر طبیعت کا حجاب یا خود اس کا کمال مانع ہوا اور ارادتاً کوئی یادگار اس نے اپنے پیچھے نہ چھوڑنی چاہی۔

مئی ۱۸۶۲ء میں الفنسٹن کالج کے پروفیسر فارسی مقرر ہوئے اور (۲۶) سال تک اپنا فرض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا۔ اس کا استقلال، اس کے پاکیزہ صفات، اس کے شریفانہ اطوار، اس کی بلند حوصلگی اور وسعتِ خیالات کا اثر ان سب پر موجود ہے جو اُن سے واقف تھے یا جنھوں نے اس کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ کالج کے وہ طلبا، جو اس زمانۂ دراز میں رہے آئے اور گئے ان کی آنکھوں میں اس نامور شخص کی صورت ان کے دلوں میں اس کی قابلیت اور عجیب خیالات و حرکات اور ان کے خیالات میں اس کی جوہرِ شرافت و جوانمردی کا اثر باقی ہے۔ تمام طلبہ اور اساتذہ ان کی بہت عزت کرتے اور ان سے محبت رکھتے تھے۔ اپنی اعلیٰ قابلیتوں اور حیرت انگیز اور نہایت وسیع مطالعہ اور عربی و فارسی اور دیگر زبانوں میں وسعتِ نظر کی وجہ سے پروفیسری کے عہدہ کے لئے نہایت موزوں تھے بلکہ وہ مثال تھے اس امر کی کہ ایک بہتر سے بہتر پروفیسر ایسا ہونا چاہیئے۔ کالج کو ایسے شخص کی پروفیسری سے بڑا اعزاز اور فخر تھا مگر افسوس کہ اب ہندوستان کے کسی کالج کو ایسا پروفیسر ملنا مشکل ہے۔ ان کا علم اس قدر وسیع اور ان کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ اگر حافظؔ اور سعدیؔ کی تصانیف دنیا سے مٹ جائیں تو وہ صرف اپنے حافظہ کے زور سے بلاکم وکاست پھر پیدا کر سکتے تھے۔ ان کو اساتذہ کے ہزارہا عربی اور فارسی اشعار یاد تھے اور موقع پر بلا تامل سیکڑوں اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ عربی اور فارسی انشا پردازی میں وہ عدیم النظیر تھے۔ کالج میں پڑھاتے وقت وہ کبھی کتاب ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ ان کا حافظہ اس قدر صحیح تھا کہ اپنی یاد سے پڑھتے چلے جاتے، اور اس خوبی سے تمام مطالب کی تشریح اور تنقید کرتے تھے کہ طلبہ کو

حیرت ہوتی تھی۔ ہندوستان میں وہ عربی اور فارسی کے استادِ یگانہ سمجھے جاتے تھے اور ایران میں بھی ان کا شمار مشہور انشا پردازوں میں تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی طبیعت میں کچھ ایسا حجاب تھا کہ کبھی میدانِ شہرت میں قدم نہ رکھا اور نہ کوئی ایسا کام کیا کہ جس سے عام طور پر لوگ ان کی اعلیٰ قابلیت کا صحیح اندازہ کر سکتے اور یہی وجہ ہے کہ پبلک میں ان کا سکہ نہ بیٹھا اور بہت سے لوگ بمبئی سے باہر ان سے ناواقف رہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان سے واقف تھے، بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ طبیعت میں اس قدر آمد تھی کہ بلا مبالغہ ایک امڈا ہوا دریا ہے کہ چلا آرہا ہے اور جو بات منہ سے نکلتی ہے موزوں نکلتی ہے۔ اگر ان کے تمام اشعار جمع کئے جاتے تو ایک ضخیم کتاب بن جاتی مگر مرنے سے چند سال پہلے انھوں نے اپنی تمام نظموں کو تلف کر دیا، صرف چند نظمیں باقی رہ گئیں جو اس وقت ان کے ہاتھ نہ لگیں۔ مرزا حیرت کی ایک ایک شے اعلیٰ درجہ کی تھی۔ ان کا دماغ، ان کا حافظہ، ان کی قوت مشاہدہ، ان کی فیاضی سب غیر معمولی تھی۔ ان کی نظروں میں روپے کی حقیقت خاک دھول کے برابر تھی۔ سوائے اس حالت کے جب کہ وہ کسی بیکس مظلوم کی امداد میں خرچ کرتے۔ انہیں اپنے فرضِ منصبی کا بہت بڑا خیال تھا، اور اپنے فرض کے ادا کرنے میں اپنی صحت تک کی بھی پروا نہ کرتے تھے وہ ہر چیز سے درگزر کر سکتے تھے مگر جھوٹ، ریا اور دنائیت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ایک بڑے فلاسفر اور انسانی فطرت کو غائر نظروں سے دیکھنے والے تھے۔ وہ اپنے قوم و ملک کے تمام علوم و فنون سے واقف تھے اور درحقیقت ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اسلامی ممالک کی سیاسی اور علمی تاریخ میں ان کی نظر بہت وسیع تھی، اور قدیم سے قدیم علمی اور تاریخی حالات ان کی نظر میں ایسے ہی تھے جیسے موجودہ زمانے کے واقعات۔ انھوں نے فلسفہ، منطق، نجوم اور طب کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ عربی اور ایرانی کھانے بھی خوب پکانا جانتے تھے، مگر انہیں خاص دلچسپی دینیات سے تھی اور آخر دم تک وہ دنیا کے تمام مذاہب کے علم اور مذہبی صداقت کی جستجو میں سرگرم رہے اگر وہ اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا کے کہنے پر چلتے تو آج سلطنتِ ایران میں شاہ کے بعد سب سے بڑے شخص یا مشہور شاعر یا مصنف ہوتے اور اگر انہیں اپنے ارادے میں کامیابی ہو جاتی تو آج وہ کسی گمنام اسلامی خانقاہ میں دفن ہوتے۔ نیرنگی تقدیر دیکھئے کہ نہ یہ ہوا اور نہ وہ زندگی جو نہ معلوم کیسے کیسے عجیب و غریب حادثوں

شورشوں اور انقلابات میں کٹتی انگریزوں کے پُرامن عہد میں بمبئی کے الفنسٹن کالج میں بسر ہو گئی اور ایک ایسے مفید پیشے میں بسر ہوئی جو تمام انقلابات سے بری ہے۔

پروفیسر حیرت اس زمانے میں ضعیف ہو گئے تھے۔ اور یہ خیال تھا کہ مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد جب پنشن لے کر فارغ البالی سے بسر کریں گے تو ان کی صحت درست ہو جائے گی لیکن یہ امر ناشدنی تھا۔ وہ ماہِ اگست ۱۸۹۹ء میں اتفاقاً اپنے باغ (بہ مقام پرپل جو مضافات بمبئی سے ہے) میں گر پڑے اور اس وقت سے رفتہ رفتہ ان کی قوت نے جواب دے دیا اور آخر اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔

ان کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کے دو پرانے شاگردوں نے پورا پورا حق خدمت ادا کیا وہ ہر وقت ان کے پاس حاضر رہتے اور کامل طور پر ان کی نگہداشت اور غور و پرداخت کی۔ وہ پاک طینت عالی دماغ فاضل جس گمنامی کو ہمیشہ پسند کرتا تھا اسی گمنامی میں یہاں سے چل بسا۔ افسوس دنیا نے اسکی پوری قدر نہ کی، اور نہ وہ چاہتا تھا کہ دنیا میری قدر کرے۔ وہ دنیا اور دنیا والوں کی قدر و منزلت سے مستغنی تھا۔ مگر وہ چند لوگ جو اس کی اعلیٰ خوبیوں کے سچے قدردان تھے اس پر دل سے آبدیدہ ہوئے اور حسرت و افسوس کے ساتھ اسے مادرِ زمین کی آغوش میں لٹا دیا۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہی ملکِ روم ہے اور سرزمینِ رُوس ہے
سب طرح سے راحت و حشمت میں کیجے زندگی — اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
سنتے ہی عبرت پکاری اک تماشا ہیں تجھے — چل دکھاؤں تو جو حرص و آز کا محبوس ہے
لے گئی اک بار کن گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھو تو ان سے کہ مال و حشمتِ دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

مرحوم اپنی تمام کتابیں الفنسٹن کالج لائبریری کو وصیت کر مرے ہیں جو کالج میں ایک زمانۂ دراز تک مرحوم کی یادگار رہیں گی۔

سید محمود مرحوم
کی وفات پر
تقریر

مولوی عبدالحق صاحب بی اے
سابق طالب علم مدرسۃ العلوم مسلمانان
علی گڑھ جو حیدرآباد کے جلسۂ تعزیت
میں کی گئی
۱۹۰۳ء

حضرات! آپ سن چکے ہوں گے کہ چند روز ہوئے ہم میں سے ایک بہت بڑا شخص اٹھ گیا ہے، جس کے انتقال پر آج ہم اظہارِ غم کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موت اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لئے کوئی ڈر کی چیز نہیں، لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو، خصوصاً جب کہ اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقتوں میں عدیم النظیر ہو اور خاصکر جب یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جہاں پہلے سے ہی قحط الرجال ہے تو ایسی موت غضب ہے اور قیامت ہے۔

بہت کم لوگ لکھے پڑھے ایسے ہوں گے جو مرحوم کے نام سے واقف نہ ہوں باوجودیکہ نہ ان کی ایسی زیادہ تصانیف ہیں جو ملک میں رائج ہوں اور نہ وہ ایسے کچھ مضامین اور آرٹیکل لکھنے والوں میں سے تھے جنھیں اخباری دنیا میں شہرت ہو۔ تاہم ان کا نام بہت سے ایسے لوگوں سے زیادہ مشہور ہے جن کی تصانیف پوٹ کی پوٹ ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اسے ایسا جوہر عطا کیا تھا جس کے سامنے بڑی بڑی تصانیف

کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ جوہر اس کی غیر معمولی دماغی قوت تھی جو نہ امتحانات کے پاس کرنے سے حاصل ہوتی ہے نہ کتابوں کے پڑھنے سے اور نہ فضیلت کے دستار باندھنے سے اور نہ ان کی تعلیمی حالت کوئی خاص طور پر ممتاز تھی۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ہندوستان میں صرف میٹرک کا امتحان دیا تھا اس کے بعد سرکاری وظیفہ سے ولایت گئے جہاں انھوں نے کوئی اعلیٰ امتحان نہیں دیا۔ سوائے ڈگری حاصل کرنے کے اور ایسے ڈگری یافتہ خیر سے ہمارے ملک میں سیکڑوں ہیں۔ اس شخص کی زندگی کی سچی مثال اس امر کی ہے کہ لیاقت کی معیار امتحانات اور ڈگریاں نہیں ہوسکتیں، البتہ قیامِ ولایت میں انھیں ایک امر میں ضرور تفوق ہے اور وہ یہ کہ وہاں انھیں اعلیٰ صحبت نصیب ہوئی۔ چنانچہ اس صدی کا سب سے بڑا انگریز شاعر لارڈ ٹینی سن اور اس صدی کا سب سے بڑا انگریز فلاسفر مل اور ایک بہت بڑا عالم پروفیسر ان کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔

ولایت سے آنے کے بعد انھوں نے کچھ دن بیرسٹری کی جس میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی۔ اور ان کی تعلیم میں جو قرض ہوگیا تھا اسے ادا کیا۔ نواب مختار الملک بہادر مرحوم جو بلا کے مردم شناس اور قدردان تھے انھیں حیدرآباد کھینچ لائے۔ غالباً وہ سال بھر تک یہاں رہے۔ یہاں سے جانے کے بعد لارڈ لٹن نے انھیں سشن جج مقرر کیا۔ سرسید نے اسے پسند نہیں کیا اور کہا میرا مقصد محمود کو تعلیم دلانے سے یہ ہرگز نہ تھا کہ ملازمت کے پھندے میں پھنس جائے بلکہ ہمیشہ میرا منشا اس کی تعلیم سے یہ رہا کہ وہ مجھے میرے کام میں مدد دے۔ لیکن لارڈ لٹن کے اصرار سے وہ چپ ہو رہے۔ تھوڑے عرصے بعد وہ ہائی کورٹ کے جج ہوگئے۔ یہاں آکر اُن کے اصل جوہر کھلے اور ان کی غیر معمولی اور وسیع لیاقت کو امتحان کا کافی میدان ملا۔ تمام بڑے بڑے قانون دانوں نے اس امر کو تسلیم کرلیا ہے کہ محمود کا دماغ قانون کے لئے خاص طور پر بنا تھا۔ ان کے فیصلوں سے ان کی حذاقت، تحقیق اور وسعتِ نظر اور ذوقِ سلیم کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بڑے بڑے ماہرینِ فن اور اساتذہ ان فیصلوں کو دیکھ کر عش عش کرتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تیرہ خاک میں بھی ایسے قابل جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے یہ فیصلے دنیا میں ان کی بڑی یادگار رہیں گے۔ اگرچہ وہ اس سے اعلیٰ اور بہتر یادگار چھوڑ سکتا تھا، لیکن خود اس کا حجاب یا کمال اس کا مانع ہوا اور کوئی یادگار نہ چھوڑ سکا لیکن یہ بات صرف قانونی مسائل پر موقوف نہ تھی بلکہ جن صاحبوں کو اس بے نظیر شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر فن میں

خواہ ادب ہو یا فلسفہ و تاریخ وغیرہ وہ ایسی ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ خود اس فن کے ماہرین بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ ایک بڑے عالم نے مجھ سے بیان کیا کہ اگرچہ وہ عربی نہیں جانتے تھے لیکن جب کبھی کسی فقہی مسئلے کو دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو وہ کتاب پڑھوا کر سنتے اور مطلب پوچھتے لیکن بعض اوقات اِدھر اُدھر کے بعض الفاظ سمجھ جانے سے کہتے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے اور خود بیان کرتے۔ یہ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی زبان سے ان مسائل کو سن کر حیرت ہوتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ تیرہ سو سال کے عرصہ میں اگر کوئی شارع کا صحیح مطلب سمجھتا ہے تو وہ محمود ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص کس بلا کا دماغ لے کر آیا تھا۔ اس کی دماغی قوت کا صرف وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن کو اس سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس کی باتیں نہایت پُرلطف اور مزے کی ہوتی تھیں، ان میں ایک جادو تھا جو سامعین کے دل پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص اور ہر فرقہ میں مقبول تھا اس کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا وہ زندہ انسائیکلوپیڈیا تھا اور اس کی باتیں اور گپ شپ نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھی۔ کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث اس کے سامنے پیش کیجئے وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سمجھا دیتا تھا، وہ ساتھ ہی اس کے بڑا ظریف تھا۔ اور اس کی ظرافت بھی عجب شان کی ظرافت تھی۔ اس کے ایک ٹھٹھول میں وہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعہ اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی نہیں حاصل ہو سکتے۔ وہ ایک ایک چٹکلے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتا تھا اس کے خاص خاص لفظ اور خاص خاص جملے جن میں جدت اور طباعی کی بو پائی جاتی تھی۔ اب تک دلوں میں چبھتے ہیں۔ اس کا لب و لہجہ اس کی شیریں بیانی اور بعض اوقات اس کے ڈرامیٹک حرکات انسان کو پھڑکا دیتی تھیں۔ اس کی گفتگو میں جو سحر تھا وہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اس کے ان سے باتیں کرنے میں جو بڑا سبق حاصل ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیئے ورنہ صحیح نتیجہ اخذ کرنا محال ہے۔ رسوم کی پابندی، عادت کے بندھن ہمیشہ بلا ارادہ بھیڑیا چال پر مجبور کرتے ہیں اور تقلید اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو خلافِ عادت ہے نظر نہیں آتی، وہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتا تھا جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا اور معمولی سے معمولی بات میں وہ شان پیدا کر دیتا تھا جو دوسروں کو نہیں سوجھتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت

کا کہ انسان واقعات کے ہر پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے لئے مفید نہیں ہو سکتی لیکن افسوس اب ہم اس کی صحبت سے مستفید نہیں ہو سکتے وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ گویا وہ ہم میں سے تھا لیکن اس کی باتیں ہم سے نرالی تھیں ؎

یا وہ جوہر ہی الگ تھا جوہر انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

کالج کے قائم کرنے اور اس کی اسکیم کے تیار کرنے میں وہ شروع سے اپنے والد کے مؤید اور معین تھے اور خصوصاً سب سے پیشتر کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خیال سید محمود کے دل میں پیدا ہوا اور سب سے اوّل اس کی ایک اسکیم انھوں نے پیش کی وہ ہمیشہ کالج کی امداد کرتے رہے، اور دل کھول کے کی۔ سر سید احمد خاں مرحوم اپنی اور سید محمود کی ان رقوم کا کبھی حساب نہیں رکھتے تھے جو مدرسے کی اعانت میں انھوں نے وقتاً فوقتاً دیں۔ اس لئے ٹھیک اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ علاوہ قلمی امداد کے مالی امداد بھی انہوں نے بہت کچھ دی۔ جو معاملات گورنمنٹ اور کالج کے مابین یا کالج کے یورپین پروفیسروں کے متعلق ہوتے وہ ہمیشہ مرحوم کے سپرد کئے جاتے تھے اس بارے میں ان کی بعض تحریریں نہایت قابلِ وقعت ہیں خصوصاً کالج کے معزز وزیٹروں وحکامِ اعلیٰ کو ایڈریس دینے کی خدمت خاصکر مرحوم کو تفویض کی گئی تھی۔ چنانچہ آخر میں جو ایڈریس اُن کے لکھے ہوئے ہیں ان میں اور پہلے ایڈریسوں میں بیّن فرق معلوم ہوتا ہے لیکن باوجود اس لیاقت وثروت کے اس نے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ قریباً ہر سینے میں مشتعل ہے، وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھا۔ ورنہ وہ چاہتا تو اس قدر شہرت اور دولت حاصل کر سکتا تھا جو دوسروں کی قدرت سے باہر ہے لیکن اس نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور مستانہ وار ٹھکرا کر چلا گیا۔ ملٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شہرت انسان کا فطری ضعف ہے اور حقیقت میں سچ بھی ہے۔ اس سے بچنا قریب قریب محال ہے لیکن بعض خدا کے بندے جنھیں غیر معمولی دماغی قوت عطا ہوئی ہے اور جن کا علم وفضل تبحر کے رتبہ کو پہنچ گیا ہے ایسے بھی ہیں کہ شہرت پر لات مار کر کنجِ تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اور خیالات میں خواہ وہ بادِ ہوائی کیوں نہ ہوں، مگن ہیں۔ یا تو وہ اس ضعف کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ

انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تئیں ایک غلام یا بیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے، اور چند بد مذاقوں کی ہاہا یا چند سمجھ داروں کی واہ واہ کے لئے کاغذ کو سیاہ اور لب کو وا کرنا گوارا نہیں کرتے بعینہٖ یہی حالت اس عزیز کی تھی۔ یہ شیر بیشۂ عزلت کہا کرتا تھا۔ "کیا حاصل ہے شہرت سے، یہی نا کہ لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں۔ بالفرض اگر یہ ہوا بھی تو اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے اور اگر یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ چھپوا کر اپنے کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں کہ ایک دنیا ان کے نام سے واقف ہو جائے اور پھر پیٹ بھر کے خوش ہو لیں۔" اسی طرح وہ کہتا تھا کہ "حکومت کیا ہے؟ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ترتیبِ اشیا کے بدل دینے کا نام ہے، اس میں کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ایک شے کو اِدھر سے اُدھر اٹھا کر رکھ دیا یا ایک شخص کو یہاں سے نکال وہاں متعین کر دیا۔" اس پاک نفس عالی دماغ شخص کی حالت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پارسا صفت درویش نش صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا۔ وہ خواجہ حافظؔ کی غزلیں، قطعات ابنِ یمین اور عمر خیام کی رباعیات پڑھتا اور مزے لیتا حتیٰ کہ اس پر عمل بھی کرتا۔ وہ اپنی روزانہ ضروریات یعنی کھانا پینا، سونا، لباس وغیرہ جس پر ہم لوگوں کا بہت سا وقت اور بہت سا روپیہ صرف ہوتا ہے کچھ پرواہ نہ کرتا اور بے تکلف یہی سادہ زندگی بسر کرتا جس میں نہ نئے فیشن کو دخل تھا اور نہ پرانی وضع کا زور چلتا تھا، مگر جس قدر وہ ان چیزوں سے بے پرواہ تھا اسی قدر وہ اخلاق میں مستثنیٰ تھا۔ ایک اجنبی سا اجنبی شخص بھی جب اس سے ملتا تو اس کی وسعتِ اخلاق سے اسی قدر خوش ہوتا تھا جتنا وہ اپنے عمر بھر کے گہرے دوست اور بے تکلف یار سے مل کر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اخلاق فیاضی اور بے تکلفی کی وجہ سے ادنیٰ اور اعلیٰ ہر طبقہ اور ہر ملت کے لوگوں میں مقبول تھا۔ اس عزیز کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی اصل ترقی دماغی قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے۔ انسان کی روح کو اگر ایک گاڑی تصور کیا جائے تو یہ جوڑی اس کی کھینچنے والی ہے لیکن اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین کیا فلک الافلاک تک پہنچ جائے گی۔ لیکن خدانخواستہ اس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی گئی تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن ہم اس کی زندگی کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہیں گے کیونکہ اب

وہ وہاں ہے جہاں ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی۔ اور جو کچھ اس نے چھوڑا ہے وہ بھی ایسا کچھ ہے کہ اس کی نظیر نہیں یہ بات کہ وہ اس سے اعلیٰ اور بہتر یادگار چھوڑ سکتا تھا اس کا الزام ہم اس پر نہیں دے سکتے یہ ہماری بدنصیبی ہے۔

دوستو! دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خوبیاں ہوں جو عام طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا عجائبات اور نوادر میں سے ہو تو ایک ایسے شخص کا ہم میں سے اٹھ جانا کیسے کچھ رنج اور کیسے کچھ الم کا باعث نہ ہوگا۔ زمانے کی ترقی کبھی رکتی نہیں اس کا قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے ممکن ہے ہم میں سے بہت سے لائق اور فاضل لوگ پیدا ہوں۔ یہ سب کچھ ہوگا مگر سید محمود کہاں! اس کی باتیں افسانے کے طور پر رہ جائیں گی اور مدتوں اس کا ذکر کر کے لوگ اسے یاد کریں گے۔

دور ہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

حضرات! وہ شخص ہم میں سے ایسا تھا جیسا کہ پودوں میں دیو۔ اس کا جسم، اس کا دماغ دونوں ایسے واقع ہوئے تھے۔ افسوس ایسی نسلیں ہم میں سے مٹتی جاتی ہیں۔ بڑی عظیم الشان چیزیں گو وہ عملی لحاظ سے کیسی ہی ساکت اور صامت ہوں لیکن صرف ان کے وجود سے ہی شاید دنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاروں بھری رات کو جب نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جن کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؟ جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے ہمارے قلب پر عجیب و غریب کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے۔ یہی حال ان وسیع نظر، عالی دماغ لوگوں کا ہے گو وہ کچھ نہ کہیں لیکن ان کا اثر نہایت پُرزور اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔ میں اخیر زمانہ میں سید محمود کو ایک شاندار انسانی کھنڈر کہا کرتا تھا۔ لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے، کیا کھنڈروں کی وقعت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی۔ کیا ہم کبھی گوارا کر سکتے ہیں کہ کسی زمانہ میں وہ زندہ یادگاریں جو زندہ ثبوت ہیں ہماری تہذیب و شائستگی کا دنیا سے نسیًا منسیا ہو جائیں۔ ایک جدید اور نئی عمارت کے خراب ہو جانے

اور اس کے ڈھے جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا کہ ایک کھنڈر کے گر جانے سے۔ لیکن افسوس وہ عالی شان کھنڈر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا اور مادر گیتی کا نہایت لائق فرزند زمین کا پیوند ہو گیا اور اپنے باپ کے پہلو میں وہاں جگہ پائی جو اس بزرگ کی سب سے مستحکم اور زندہ یادگار ہے جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اسی دھن میں دنیا سے گزر گیا۔ جہاں اب تک اس کی روح پھر رہی ہوگی۔ یہاں قوم کے دو سپوت مدفون ہیں۔ گو وہ زندہ نہیں مگر ان کی زندگانی کا نشان دنیا کی رہ گزر میں ایسا گہرا موجود ہے کہ رہ گیر وہاں پہنچ کر ٹھک جاتا ہے۔

علی گڑھ سر سید اور کالج کی وجہ سے علی گڑھ ہوا اور ایک عالم میں اس کا نام مشہور ہو گیا۔ چنانچہ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے اور مستفید ہونے کو آتے ہیں۔ لیکن اب علی گڑھ کی عظمت دہ چند بلکہ صد چند بڑھ گئی۔ اس لئے کہ اس میں ایک بدنصیب قوم کے دو بے بہا لعل مدفون ہیں۔ ایک ان میں سے باپ ہے جس نے کسان کی طرح شب و روز محنت کی اور خون پسینہ ایک کر کے اپنی قوت اور کندھے کے زور سے اپنی قوم کو پستی اور ذلت سے نکال کر دنیا میں ابھارا۔ دوسرا بیٹا ہے جو آسمانِ لیاقت پر شہابِ ثاقب کی طرح چمک کر زمین میں غائب ہو گیا۔ یہاں سیاح اور مسافر دور دور سے آئیں گے اور آنسو بہا جائیں گے۔

صاحبو! ہمیں جو اس قوم کے اعضا ہیں جس میں ایسے بہت کم لوگ پیدا ہوتے ہیں' ایسے لوگوں کی بہت قدر کرنی چاہیئے، جن کا ہونا ہمارے لئے فخر ہے۔ اور جن کے سہارے اور مدد سے قوموں کو ایسی ایسی مدد ملتی ہے کہ ایک ایک ان میں سے لاکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ صرف ایک سپاہی کی ہمت سے شکست کھاتے کھاتے فوج فتح پا گئی ہے ڈوبتے ڈوبتے جہاز صرف ایک شخص کی دانشمندی سے پار اُتر گئے ہیں یہ زمانہ ہمارے لئے بڑا کڑا زمانہ ہے ہمیں ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے ان کا ہونا ہمارے لئے نعمتِ عظمیٰ اور ان کا مر جانا ہمارے لئے بلائے مبرم ہے۔ یہ عزیز جس کی موت پر اظہارِ غم کے لئے ہم جمع ہوتے ہیں ایسے لوگوں میں سے تھا۔ اس کا غم مدتوں ہمارے لئے تازہ رہے گا۔ اب ہم سب کو اس کے لئے دل سے دُعا کرنی چاہیئے۔

"عاقبتش محمود باد"

مولوی چراغ علی مرحوم

۱۹۱۰ء

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت و لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے ابتدا میں ایک معمولی منشی کی طرح دفتر میں ملازمت کی اور محض اپنی لیاقت اور محنت سے اعلیٰ رتبے پر پہنچ گئے۔ ان کی تعلیم بہت معمولی درجہ کی ہوئی تھی لیکن لگاتار مطالعہ اور محنت کی بدولت انہوں نے وہ فضیلت حاصل کی جو بڑے بڑے ڈگری یافتوں اور صاحبانِ دستارِ فضیلت کو میسّر نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے کارنامے نوجوانانِ ملک کے لئے دلیل راہ کا کام دیں گے ان کے آبا و اجداد[1] دراصل سرینگر کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے اور وہاں سے میرٹھ آئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے

---

[1] مولوی چراغ علی مرحوم کے ابتدائی حالات ہمیں زیادہ تر مولوی محمد زکریا صاحب سہارنپوری رحال وظیفہ یاب حسن خدمات سرکار نظام سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پرانے دوست اور رفیق ہیں اور مرحوم اور ان کے

مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں ملازم ہوئے بعد ازاں ان کا تبادلہ سہارن پور ہو گیا۔ جہاں وہ کلکٹر کے دفتر کے ہیڈ کلرک تھے۔ سہارنپور میں یہ محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور تھے۔ کرانی کا لفظ اس زمانے میں انگریزی کلرکوں کے لئے بجائے بابو کے استعمال تھا۔ چنانچہ کرانی خانہ منشی خانہ کو کہتے تھے جہاں کلرک کام کرتے تھے۔ چونکہ مولوی محمد بخش انگریزی داں تھے اور کسی قدر انگریزی لباس بھی پہنتے تھے لہٰذا لوگ انھیں کرانی کہنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے معزز ترین عہدۂ گورنر جنرلی پر لارڈ ڈلہوزی نئے نئے تشریف لائے تھے۔ یہ صاحب تھے تو کم عمر مگر بلا کے ذہین، جفاکش مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ انہوں نے ملک کی آبادی اور آسائش خلائقِ عامہ کے لئے بہت سے نیک کام کئے لیکن افسوس ہے کہ ایک کام ان کے ہاتھ سے ایسا ہوا کہ ان کی ساری نیکیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ابتدا سے یہ بات ان کے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اور جس طرح بن سکے دیسی ریاستوں کو نیست و نابود کر دیا جائے اور ان کے ملک کمپنی کے علاقہ میں ضم کر دیئے جائیں۔ وہ اپنے بھادیں رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے وہ اس خیال پر اخیر تک جمے رہے اور بڑے تشدد اور استقلال سے اسے عمل میں لائے لیکن اس سے جو بُرے نتائج پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں اور اس کا برا اثر اب تک رعایا کے دل سے پورے طور سے زائل نہیں ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی سے قبل کمپنی بہادر کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ تھے۔ وہ جیسے لڑائی میں سخت تھے ویسے ہی فتح کے بعد معتدل مزاج بھی تھے۔ سکھوں سے پہلی لڑائی فتح کرنے کے بعد بیرونی اضلاع کو الگ کر کے پنجاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خاندان کو اس وقت سے جانتے ہیں جب کہ مرحوم کے والد سہارن پور میں ملازم تھے۔ مرحوم مولوی صاحب موصوف کا بہت اعزاز و احترام کرتے تھے اور مولوی صاحب کے تعلقات اب تک مرحوم کے خاندان سے ویسے ہی چلے آتے ہیں اور زمانۂ حیدرآباد کے اکثر حالات ہمیں مولوی صاحب کے بھتیجے مولوی انوار الحق صاحب سے معلوم ہوئے جو مرحوم کے پاس بچپن سے تھے اور مرحوم ان پر بہت عنایت فرماتے تھے۔ نیز دیگر حضرات سے جو جو حالات معلوم ہوتے ہیں وہ ان کے نام کے ساتھ بعد تحقیق کے لکھ دیئے گئے۔ ۱۲

انھیں لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنا انتظام خود کریں۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج الگ اپنے زور میں آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ رانی میں اتنی قوت اور دور اندیشی نہ تھی کہ وہ ان سب کو سنبھالے بلکہ اس نے کج رائے اور نا عاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھ میں پڑ کر ملک کی حالت اور بگاڑ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ ایک ایسی اچھی اور سرسبز سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے اندرونی انتظامات میں دخل دینے سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ مہاراجہ کے دربار کو پورا اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی اور دستور و آئین کے مطابق اپنا انتظام کریں لیکن روز بروز جب خرابیاں بڑھتی گئیں تو بہ مجبوری ایک کونسل مقرر کی کہ اس کی اصلاح و مشورے سے انتظامِ ریاست چلایا جائے اور کونسل کا میرِ مجلس انگریز ہو۔ پنجاب کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ہنری لارنس جیسا پاک نفس، نیک دل اور ہوشمند ریذیڈنٹ ملا۔ وہ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے اور اس خوبی اور نیک نیتی سے کام چلایا کہ رعایا ان کی عاشق ہو گئی۔ اتنے میں لارڈ ہارڈنگ ولایت کو سدھارے اور ان کی جگہ لارڈ ڈلہوزی آئے۔ اور لارڈ ہارڈنگ کے جاتے ہی سر ہنری لارنس رُخصت پر ولایت تشریف لے گئے۔ سر ہنری لارنس کے جانے کے بعد نا تجربہ کار انگریز افسروں نے رعایا کی دلداری کا مطلق خیال نہ کیا اور انتظام کے جوش میں ایسی ایسی غلطیاں کیں کہ لوگوں میں انگریزوں کی طرف سے بددلی اور نفرت پیدا ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور سکھوں میں بڑی خونریز اور خونخوار جنگ ہوئی جس سے ہندوستان اور انگلستان میں تہلکہ مچ گیا اور ایک دفعہ انگریزی حکومت جڑ بنیاد سے ہل گئی اور آخر کار انگریزوں کی فتح ہوئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جو ہندوستان کے نقشہ میں انگریزی کمپنی کی عملداری کا سرخ رنگ دیکھ کر یہ پیشین گوئی کی تھی کہ نقشہ کا سارا رنگ سرخ ہوتا نظر آتا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد پوری ہو کے رہی اور اب پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا۔ اس جدید صوبے کے انتظام کے لئے ہندوستان سے جہاں اور تجربہ کار اور لائق عہدیداران منتخب کئے گئے وہاں مولوی محمد بخش کا بھی انتخاب ہوا۔

۱۸۴۹ء میں مولوی محمد بخش محکمۂ بندوبست میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ عہدۂ مہتمم بندوبست پر سرفراز ہوئے اور کچھ عرصہ تک صوبۂ پنجاب کے اضلاع ملتان، ڈیرہ غازی خان، بنوں وغیرہ میں مامور رہے سرحدی اضلاع کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد ضلع سیالکوٹ میں متعین کئے گئے۔ اس کے بعد

ضلع شاہ پور میں اسی اہم کام پر مامور رہے۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہتمی بندوبست جیسا دقیق اور اعلیٰ عہدہ جب کہ آج کل بھی دیسی لوگوں کو شاذونادر ہی ملتا ہے تو اس زمانے میں جب کہ نہ ہندیوں کے حقوق تسلیم کئے گئے تھے اور نہ ان حقوق پر زور دینے والے ابھی میدان میں آئے تھے کیسا کچھ وقیع اور معزز سمجھا جاتا ہوگا۔

افسوس ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ مولوی محمد بخش کے حالات اور اس وقت کے واقعات معلوم نہ ہو سکے لیکن صرف یہی ایک واقعہ مولوی صاحب کی قابلیت اور لیاقت کی کافی شہادت ہے کہ حکومتِ وقت نے انھیں ایسے ایسے عہدہ پر جو کسی طرح ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر کے عہدے سے کم نہیں سرفراز فرمایا۔

سنا گیا ہے کہ مولوی محمد بخش کو اپنی اولاد کی تعلیم کے مطابق بڑے بڑے خیال تھے لیکن اجل نے مہلت نہ دی اور عین عالم جوانی میں (جب کہ ان کی عمر غالباً پینتیس سال سے زائد نہ تھی) سن ستاون کی مشہور فوجی شورش سے ایک سال قبل یعنی ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا اور سارے منصوبے دل کے دل ہی میں رہ گئے مرحوم نے چار بیٹے چھوڑے جن میں سب سے بڑے مولوی چراغ علی تھے، اور اس وقت ان کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مولوی محمد بخش مرحوم کا مقبرہ اب تک میرٹھ میں موجود ہے۔

مولوی محمد بخش کے انتقال کے بعد ان کے سب اہل و عیال یعنی ان کی والدہ، بیوی اور چاروں بچے (چراغ علی، ولایت علی، عنایت علی اور منصب علی) میرٹھ واپس آگئے۔

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیرِ سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی، لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی اور سوائے اردو فارسی اور انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی اور امتحان پاس کرنے پائے۔ اسی زمانہ میں کمشنری گورکھپور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا وہاں کے خزانے کی منشی گری پر جس کی تنخواہ بیس روپیہ تھی مرحوم کا تقرر ہوا۔ مطالعۂ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں ابتدا سے تھا۔ سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ تعلیقات اسی زمانے کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ اس کے منشور محمدی، مخبرِ صادق لکھنؤ وغیرہ میں بھی ان کے اکثر مضامین شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں مولوی محمد زکریا صاحب سہارن پور سے بستی میں محکمۂ انجینیری میں مقرر ہو کر آئے اور چونکہ مولوی صاحب کے تعلقات ان سے اور ان کے خاندان سے قدیم تھے لہٰذا دونوں صاحب ایک ہی جگہ رہنے سہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد مولوی

محمد زکریا صاحب بستی کی خدمت سے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں ان کا ایک اچھی خدمت پر تقرر ہو گیا وہاں سے انھوں نے مولوی چراغ علی کو اطلاع دی کہ آپ کے والد کے محسن مسٹر گورا وسلی یہاں جوڈیشل کمشنر ہیں، اگر آپ یہاں آئیں اور ان سے ملیں تو اغلب ہے کہ کوئی معقول خدمت مل جائے۔ چنانچہ اس اطلاع پر غالباً ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں مولوی چراغ علی لکھنؤ گئے اور مسٹر گورا وسلی سے ملے، اتفاق سے اس وقت جوڈیشل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصرمی کی جگہ خالی تھی لہٰذا اس وقت ان کا تقرر اسی خدمت پر بمشاہرہ [illegible] ہو گیا کچھ دنوں بطور قائم مقام رہے بعد میں مستقل ہو گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد سیتا پور تبادلہ ہو گیا۔

مولوی چراغ علی کا میلانِ طبع شروع سے مذہب کی طرف تھا انھوں نے ہمیشہ یا تو عیسائی معترضین کے جواب لکھے یا مذہب اسلام کی حقانیت ظاہر کی۔ چونکہ اس عالم کا یہ قانون ہے کہ قوی تر شے اپنے سے کم قوی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لئے مولوی چراغ علی بھی خود بخود امامِ وقت کی طرف جھکے اور وحدتِ ذوق سرسیدؒ سے ان کے تعارف کا باعث ہوئی۔ اگرچہ اب تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور "تہذیب الاخلاق" میں بھی ان کے بعض مضامین شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ جب سرسیدؒ لکھنؤ تشریف لائے تو مولوی صاحب مرحوم ان سے ملنے کے لئے سیتا پور سے لکھنؤ گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب ریاست حیدر آباد سے کچھ کام ترجمہ وغیرہ کا سرسیدؒ کے پاس آیا تو انھوں نے مولوی چراغ علی کو اس کام کے سرانجام دینے کے لئے منتخب کیا۔ اس بنا پر ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ علی رخصت لے کر علی گڑھ گئے اور کئی مہینے سرسیدؒ کے پاس رہ کر اس کام کو بکمال و خوبی انجام دیا۔ جس کا معاوضہ بھی ریاست سے ان کو ملا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۷۷ء میں نواب سر سالار جنگ اعظم نے بتوسط مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک) مرحوم سرسیدؒ سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسیدؒ نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدر آباد چلے آئے جہاں وہ عہدۂ اسسٹنٹ ریونیو سکریٹری (مددگار معتمد مالگزاری) پر بمشاہرہ چار سو روپیہ مامور ہوئے معتمد مالگزاری اس وقت نواب محسن الملک مولوی مہدی علی مرحوم تھے۔ اس وقت سے مولوی چراغ علی کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔

کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور پر اعلیٰ قابلیت کا ہونا بالکل ممکن ہے، لیکن اگر وہ تعصب

یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے گی اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو اس کی ترقی شاہراہ تمدن پر بہت سست ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں اعلیٰ ترقی کی ہو۔ ابتدا ابتدا میں مسلمانوں کی فتوحات اپنی ذاتی قوت سے دنیا میں آناً فاناً پھیل گئیں، لیکن ان فتوحات کو قائم رکھنے یا وسیع کرنے کے لئے یہی کافی نہ تھا۔ پھر جب انھوں نے عجم میں قدم رکھا اور امن و جنگ، تجارت و سفارت کے ذریعہ سے انھیں روزانہ دوسری اقوام سے سابقہ پڑا تو اس وقت سے ان کی ترقی کی بنیاد مستحکم ہونے لگی۔ آخر ان ہی لوگوں نے یونان کی علم و حکمت کو زندہ کیا اور تمدن میں ایسی ترقی کی کہ جس سے ایک عالم میں اجالا ہو گیا۔ یہی حال یونان و روما اور یورپ و دیگر اقوام کی ترقی کا ہے۔ تازہ مثال جاپان کی ہے۔ وہی جاپان جو اپنے آپ کو غیر ملک والوں کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا تھا اور غیر صورت کو دیکھ کر چونک اٹھتا تھا آج انھیں سے ان کے گر سیکھ کر ان کا استاد بنا چاہتا ہے۔ اہل جاپان کی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو کام وہ خود نہیں کر سکتے وہ انھوں نے غیر ملک والوں سے ملازم رکھ رکھ کر لیا اور پھر خود سیکھ کر ان کی معلمی سے مستغنی ہو گئے۔ چنانچہ ابتدا میں انھوں نے ریلوے، ٹیلی گراف، لائٹ ہوس اور بحری فوج کا انتظام انگریزوں کے سپرد کیا۔ قانونی اصلاح اور فوجی تربیت اہل فرانس کے ہاتھوں ہوئی، تعلیمی معاملات، ڈاک خانے کے انتظام اور زراعت میں اہل امریکہ سے سبق لیا۔ طبی تعلیم، تجارتی قواعد، لوکل گورنمنٹ کا دستور اور فوجی افسروں کی تعلیم جرمن والوں کے حوالے کی اور سنگ تراشی (مصوری) میں اٹلی والوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ غرض ابتدا میں ان سب سے کام لیا اور پھر خود سیکھ کر ان میں ایسا کمال پیدا کیا کہ آج دنیا کی اعلیٰ دُوَل میں ان کا شمار ہے۔ یہ زمانہ تجربات کا زمانہ ہے اور جاپان نے جو تمدن کی مختلف اور بے شمار شاخوں میں اس قدر جلد اور قابل تعریف ترقی کی ہے اسے اگر انیسویں صدی کا اعجاز کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ سر سالار جنگ اول کی تدبیر اور چارہ سازی اور جاپان کی بیداری کا بالکل ایک زمانہ تھا جاپان نے اپنے ملک کو ہشیار کرنے اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کے لئے جو تدبیر اختیار کی تھی بعینہٖ وہی تدبیر اس دور بیں اور عالی دماغ وزیر نے اس ملک میں اختیار کی اور باہر سے قابل، تجربہ کار اور شائستہ لوگوں کو بلا کر کام لیا۔ ان لوگوں نے ملک کے انتظامات کو درست کر لیا، پرانی خرابیوں کی اصلاح کی، نئے نئے دفاتر

قائم کئے اور ان کو صحیح اصولوں پر چلایا، ملک کے ذرائع پر غور کیا اور آمدنی کو بڑھایا، تعلیم کو رونق دی، تہذیب وشائستگی پھیلائی اور ملک اور گورنمنٹ کو خاصا مہذب اور شائستہ بنا دیا لیکن کیا وجہ ہے کہ جاپان اس عرصہ میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور یہ ملک وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرونی امداد بڑی کارآمد اور مفید چیز ہے، بشرطیکہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو، لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لئے سب کچھ ہوتا چلا جائے تو یہ محض خیال بلکہ جنون ہے۔ اہلِ جاپان میں حبِ وطنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور ہر جاپانی اس شد و مد اور جوش سے کام کرتا تھا کہ گویا ساری سلطنت کا بار اسی پر پڑنے والا ہے۔ اور ہر شخص کی دلی آرزو یہ تھی اور اسی خیال سے محنت کرتا تھا کہ وہ سارے عالم میں جاپان کی دھاک بٹھا دے اور طرفۃ العین میں اسے عروس الممالک بنا دے۔ برخلاف اس کے یہاں یہ باتیں ابھی خواب وخیال سے بھی کوسوں دور ہیں۔ دفاتر اور ہر قسم کے سررشتے جو ایک مہذب ملک میں ہونے چاہئیں، یہاں بھی موجود ہیں۔ کونسلیں ہیں، کمیٹیاں ہیں، قابل سے قابل ڈگری یافتہ افسر بھی ہیں۔ کمیٹیاں ہوتی ہیں، تجویزیں پیش ہوتی ہیں۔ رزولیوشن پاس ہوتے ہیں۔ نئی نئی اسکیمیں جاری ہوتی ہیں، روپیہ وصول ہوتا ہے، ذرائع آمدنی بھی سوچے جاتے ہیں، رپورٹیں بھی لکھی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن حیات کا نام نہیں۔

سر سالار جنگ نے اس تدبیر کے ساتھ بڑی دانشمندی یہ کی تھی کہ ابتدا میں انھوں نے قابل لوگوں کو سر سیدؒ سے طلب کیا، یہ دو عالی دماغ شخص سرزمین ہندوستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ انیسویں صدی کے مسلمان ان پر جتنا فخر کریں وہ بجا ہے اور ایسے وقت میں ہوئے جب کہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ سر سیدؒ کے انتخاب اور سر سالار جنگ مرحوم کی قدردانی اور کارفرمائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس طرح جو لوگ انتخاب کیے گئے انھوں نے اپنے فرائض کمال وفاداری اور قابلیت سے ادا کئے اور وہ ہمیشہ عزت وحرمت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔ انھیں میں سے ایک مولوی چراغ علی مرحوم بھی تھے۔

ابتدا میں مولوی چراغ علی کا تقرر مددگار معتمد مالگزاری پر بمشاہرہ چار سو روپیہ ماہانہ ہوا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد سات سو روپیہ ہو گئے۔ بعد ازاں عہد وزارت نواب عماد السلطنۃ مرحوم میں جب نواب محسن الملک مرحوم معتمد پولٹیکل وفینانس مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی کا تقرر معتمد مالگزاری بمشاہرہ

پندرہ سو روپیہ ہوا۔ عہد وزارت سر آسمان جاہ بہادر مرحوم میں جب کہ بمصالح وقت مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک)، معتمد مالگزاری مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی صوبہ داری ورنگل پر مامور ہوئے اور پھر صوبے داری گلبرگہ پر تبادلہ ہوگیا۔ دو سال بعد نواب محسن الملک مرحوم کے چلے جانے پر معتمد مال وفینانس مقرر ہوئے۔

غالباً مولوی چراغ علی سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کو اس طرح بے لاگ بے تعلق اور بے لوث ہو کر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانبداری جانتے ہی نہ تھے معاملات میں وہ یہ بالکل بھول جاتے تھے کہ ان کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات ان کے پیشِ نظر رہتے تھے اور انہیں پر وہ بلا رو رعایت فیصلہ کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل حیدر آباد جو ان باتوں کے عادی نہیں ان سے کبھی خوش نہیں رہے۔ وہ روزانہ سوائے اہم امور کے بہت کم کام کرتے تھے جب کام بہت سا جمع ہو جاتا تھا تو وہ دو تین روز جم کر کام کرتے تھے اور سب کو ایک ہی دفعہ ختم کر دیتے تھے۔ وہ کبھی طول وطویل فیصلے نہیں لکھتے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم مسلوں اور مدتوں کے پیچیدہ معاملات کو چند سطروں میں سُلجھا دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا گویا معاملے کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ اُن کی تحریر جامع ومانع اور حشو وزوائد سے پاک ہوتی تھی اور یہی حال ان کی تمام تصانیف کا ہے۔ لفظِ اشد ضروری سے انہیں سخت چڑ تھی، اور اس قسم کے جو مراسلات آتے وہ انہیں اُلٹا کے پھینک دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ سمجھتے سمجھاتے خاک نہیں، خواہ مخواہ مراسلات پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب مرحوم نے لکڑی کا ایک صندوق بنا رکھا تھا، جو اشد ضروری لفافہ آتا وہ اس میں بے پڑھے ڈال دیتے تھے۔ ایک بار مدار المہام بہادر کے ہاں کمیٹی تھی ان میں ان کے بعض ہمعصروں وہم رُتبہ معزز عہدیداروں نے مدار المہام بہادر کے سامنے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ تالیف وتصنیف میں مصروف رہتے ہیں یا سوتے رہتے ہیں کہ ہمارے ضروری اور اشد ضروری مراسلات کا بھی جواب نہیں دیتے۔ مولوی صاحب نے کہا ذرا تامل فرمائیے، میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ آدمی سے کہا وہ صندوق لاؤ۔ صندوق آیا اور انہوں نے مدار المہام بہادر سے مخاطب ہو کر کہا کہ سرکار دیکھئے ان صاحبوں کے تمام اشد ضروری لفافے اس میں موجود ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک لفافہ بھی نہیں کھولا۔ سب کے سب بند پڑے ہیں

اب میں ان میں سے کوئی سا ایک اٹھا لیتا ہوں چنانچہ انھوں نے اس میں سے ایک لفافہ اٹھا لیا، اسے کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ فلاں تختہ بھیج دیا جائے۔ مراسلہ پڑھ کر سنانے کے بعد مدار المہام سے عرض کی کہ اس کا اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ یہ کونسا اشد ضروری کام تھا۔ یہ لوگ اشد ضروری کے معنی نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ لفافوں پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں جواب نہیں دیتا۔ پھر فرمایا کہ شاید سال بھر میں دو تین ہی واقعے اشد ضروری پیش آتے ہوں گے۔ ان حضرات نے ہر ایک بات کو اشد ضروری خیال کر لیا ہے۔

مولوی طالب الحق صاحب مددگار صدرِ محاسب جو سرکار عالی کے ایک نہایت متدین قابل اور تجربہ کار عہدہ دار ہیں اور سر سالارِ جنگ مرحوم کے زمانے سے اب تک مختلف عہدوں پر رہے ہیں اور خود بھی مولوی چراغ علی مرحوم کے تحت کام کر چکے ہیں فرماتے ہیں کہ اگرچہ مجھے سرکارِ عالی میں ایسے ایسے عہدیداروں کے ساتھ کام کرنے کا سابقہ ہوا ہے جو اپنے کمال اور خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے۔ لیکن مرحوم میں بعض خصوصیات ایسی تھیں کہ پھر کسی میں نظر نہ آئیں۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھے بڑے غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے، گویا وہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ مولوی صاحب موصوف نے راقم سے ایک خاص معاملے کے متعلق ذکر کر کے فرمایا (اور اس مسل کا بھی حوالہ دیا)، کہ مرحوم کے زمانۂ مددگاری میں سر سالار جنگ مرحوم نے مولوی صاحب مرحوم کی رائے سے اس میں اختلاف کیا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا رجحان معتمد (نواب محسن الملک مرحوم) کی رائے کی طرف ہے اور مولوی صاحب مرحوم کی رائے پر چند سوالات کئے۔ مرحوم نے نہایت مدلل جواب دیا۔ اس پر کچھ سر سالارِ جنگ مرحوم نے اعتراض اور سوال کئے۔ ادھر سے پھر اس کا جواب ادا کیا گیا۔ کوئی چار پانچ مرتبہ ایسے ہی سوال و جواب ہوئے اور آخر نواب مدار المہام مرحوم بہادر قائل ہو گئے اور یہ تحریر فرمایا کہ میں دیکھتا تھا کہ آپ اپنی رائے کے متعلق کیا دلائل رکھتے ہیں اور بیشک آپ کی رائے صحیح اور درست ہے۔ اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور ان کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے ایک دو لفظ کہہ دیتے تھے جس سے مافی الضمیر ادا ہو جائے۔ جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری

تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ نہایت تیز فہم اور صائب الرائے تھے۔

جناب مولوی سید علی حسن خاں بہادر سابق معتمد فینانس و حال وزیر جاورہ جو مولوی چراغ علی مرحوم کے بہترین جانشین ہوئے اور بوجہ اپنی اعلیٰ قابلیت، تدین، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے ہماری قوم کے بے مثل افراد میں سے ہیں، راقم سے فرماتے تھے کہ ایک بار نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم فرمانے لگے کہ مولوی چراغ علی بھی عجیب و غریب آدمی تھے اور اس کے بعد انھوں نے ایک پارسی جنٹلمین کا واقعہ بیان کیا جسے وظیفہ رعایتی یا رقم دینے کے متعلق نواب صاحب مرحوم نے حکم دیا تھا مولوی چراغ علی مرحوم نے معاملہ کو ٹال رکھا تھا۔ اس نے آکر نواب صاحب سے شکایت کی کہ معتمد صاحب کچھ تصفیہ نہیں کرتے اور معاملہ کو ڈال رکھا ہے۔ نواب صاحب نے پھر حکم لکھا مولوی صاحب مرحوم چپ سادھ گئے۔ اس نے کچھ عرصے کے بعد شکایت کی۔ نواب صاحب نے پھر لکھا، مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے بے چارہ سائل کچھ دنوں تک اپنے معاملے میں تگ و دو کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی تو پریشان ہو کر پھر نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رویا دھویا۔ نواب صاحب مرحوم جو مروت کے پتلے تھے فرمانے لگے کہ اچھا جب مولوی چراغ علی یہاں آئیں تو ہمیں یاد دلا دینا۔ غرض وہ تاک میں رہا۔ جس روز مولوی صاحب بارگاہِ وزارت میں حاضر ہوئے تو اس نے یاددہانی کرائی۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ میں نے فلانے معاملے میں آپ کو تین بار حکم دیا، مگر آپ نے اب تک اس میں کچھ نہ کیا۔ مولوی صاحب نے اس کا جواب کچھ نہ دیا اور مسل صندوق میں سے نکال کر سامنے رکھ دی۔ نواب صاحب نے کسی قدر جھنجھلا کے کہا کہ مسل کو کیا کروں آپ کو کئی بار لکھا گیا ہے اور آپ نے اب تک ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی، مولوی صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "آپ اسلئے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لٹا دیں۔ آپ کا کام خزانے کی حفاظت ہے۔" یہ جواب سن کر نواب صاحب مرحوم بالکل ساکت رہے، اور پھر کبھی آپ نے مولوی صاحب سے اس معاملے کے متعلق تحریک نہ کی۔ یہ واقعہ خود نواب وقار الامرا بہادر مرحوم کی زبانی ہے اور حق یہ ہے کہ مولوی چراغ علی کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے ان کی اخلاقی جرأت اور راست بازی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولوی سید علی حسن صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ اضلاع پر سے جو تختے (گوشوارے) آتے

تھے اوران پر جو مولوی صاحب مرحوم تنقیح کرتے تھے اس سے ان کی دقتِ نظر اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ جو عہدیدار کہ بڑے بڑے دورے کرتے ہر معاملہ کی چھان بین کرتے اور انتظامی معاملات میں باخبر رہتے تھے ان سے تعلقدار لوگ اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا مولوی چراغ علی مرحوم کی گھر بیٹھے تختوں کی تنقیح سے۔

مطالعہ میں بے حد شغف تھا۔ گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے جاتے تھے اور انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سو گئے، اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے، اتنے میں سو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔ مسٹر محبوب علی (سپرنٹنڈنٹ مدرسۂ صنعت و حرفت اورنگ آباد فرزند مرحوم) اپنی والدہ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتی تھیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو ان کے سینے پر سے کتاب اٹھا کے رکھوں، ورنہ کتاب کے جلد پٹھے سب ٹوٹ کے رہ جاتے تھے۔ تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں تو ضرور جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاصکر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا تھا۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔ ان کا کتب خانہ قابلِ دید تھا، اس میں بہت کم ایسی کتابیں تھیں جو ان کی نظر سے نہ گزری ہوں، یا جس پر ان کے نشان یا نوٹ نہ ہوں۔ مطالعہ میں انھیں ایسی محویت رہتی تھی کہ کچھ ہو جائے انھیں خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مولوی سید تصدق حسین صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ کو جو بہت باوضع اور ہمدرد بزرگ ہیں، علاوہ قدیم تعلقات کے ایک مدت تک شب و روز مرحوم کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا ہے۔ مرحوم کے ملازم کلو کی زبانی فرماتے تھے کہ بلدہ میں مرحوم کا جو بنگلہ ہے اس میں ڈرائنگ روم کے سامنے ایک شہ نشین ہے اس کے نیچے تہہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹ کباڑ ڈیرے اور خیمے پڑے رہتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب مرحوم اس شہ نشین پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اتفاق سے تہہ خانے میں آگ لگ گئی اور دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ ملازموں نے بہتیرا شور و غل مچایا کہ آگ لگ گئی مگر حضرت کو کچھ خبر نہیں۔ غرض آگ لگی اور بجھ بھی گئی مگر آپ جس طرح پڑھ رہے تھے، پڑھتے ہی رہے اور یہ بھی تو خبر نہ ہوئی کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔ مولوی انوار الحق

صاحب نے اپنا چشم دید واقعہ جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کھانا کھا رہے تھے اور اس کے نیچے تہہ خانہ میں آگ لگ گئی اور وہ اسی طرح بے تکلف بے ہراس کھانا کھاتے رہے۔ یا تو یہ دونوں واقعے ایک ہیں یا کلو کے بیان کرنے میں غلطی ہوگئی ہے مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے اور اس سے ان کے استقلالِ طبع کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ایک دوسرا واقعہ اسی قسم کا ایک صاحب نے اپنا چشم دید بیان کیا ہے کہ ایک مقام پر تانگے میں سوار وہ دورہ کر رہے تھے۔ رستہ میں تانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اسی میں پڑے پڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ لوگ گئے اور کسی دوسرے تانگے کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو اس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

تحقیق اور تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کے مالہ وما علیہ کے سُراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لئے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے، اور لوگوں کو بھیج کر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے۔ چنانچہ اسی غرض سے مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کو مصر روانہ کیا تھا۔ مولوی عبداللہ صاحب مرحوم نے جو خط مرحوم کو مصر سے لکھا تھا وہ ہم نے خود دیکھا ہے۔ اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسرے لوگوں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لئے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، اور مواد فراہم کرنے کے لئے انھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی ہے۔

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب سابق اسسٹنٹ سکرٹیری پولٹیکل فنانس و ناظم مردم شماری (اسوشئٹ رائل اسکول آف مائنز، فیلو آف دی جیولاجیکل سوسائٹی وغیرہ وغیرہ) راقم سے فرماتے تھے کہ جب برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ریاست میں مسٹر کرالی کے کنٹرولر جنرل مقرر ہونے کی خبر آئی تو چونکہ مولوی صاحب مرحوم فنانشل سکرٹیری تھے، انھیں فکر ہوئی۔ آخر انھوں نے فنانس پر انگریزی میں جس قدر مستند اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں تھیں، سب منگوالیں اور ان کا خوب مطالعہ کیا اور دو مہینے میں اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی اور فنانشل معاملات پر گفتگو آئی تو مولوی صاحب کی وسیع معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اسی طرح جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہندی موسیقی پر یورپین لوگوں کو اعتراض ہے تو انھوں نے اسے سیکھنا شروع کیا۔ اور پیانو پر گیتیں نکالنا شروع کیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہندی موسیقی کو سائنٹفک طور پر مدون کریں۔ چنانچہ لکھنا بھی شروع کیا تھا اور اس کا ناتمام سا مسودہ اب بھی موجود ہے لیکن اس کام کے لئے بڑی فرصت درکار تھی لہٰذا اسے انجام نہ دے سکے۔ علم ہیئت میں انھیں خوب دخل تھا۔

متعدد علوم اور کئی زبانوں کے عالم تھے۔ چنانچہ سر سیدؒ ان کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں "متعدد علوم میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے اور بولتے تھے۔ عبری و کالڈی زبان میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے انگریزی زبان میں بھی انھوں نے تصنیفیں کی ہیں" زیادہ تر اُن کی تصانیف انگریزی زبان میں ہیں جن کا مفصل ذکر ان کی مذہبی تصانیف میں آگے چل کر کیا جائے گا لیکن یہاں اس قدر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُن کی ابتدائی تعلیم خاصکر انگریزی زبان میں بہت کم ہوئی ہے لیکن انھوں نے صرف اپنے مطالعہ کے زور سے انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت حاصل کرلی تھی یہ صرف ہم ان کی مطبوعہ کتب کو دیکھ کر ہی نہیں کہتے بلکہ ہم نے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی دیکھے ہیں۔ ان کی انگریزی کی کتابوں پر ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات نے جو زبردست ریویو کئے ہیں ان کی انگریزی تحریر کی بھی تعریف کی ہے۔ ہم بطورِ نمونہ یہاں ایک دو ریویوؤں سے صرف ان کی انگریزی دانی کے متعلق چند فقرے نقل کرتے ہیں

اے تھی نیم نے جو انگلستان کا ایک مشہور پرچہ ہے اور جس کی ادبی تنقید کی دھوم ہے ان کی کتاب زیرِ دیباچہ پر ایک بڑا ریویو لکھا ہے اور لکھتا ہے کہ مولوی صاحب کی انگریزی قابلِ قدر ہے۔" بابت ۸ جنوری ۱۸۸۴ء)

بمبئی گزٹ جو بمبئی پریسیڈنسی کا بہت قابل قدر اخبار ہے لکھتا ہے کہ "یہ کتاب نہایت عمدہ انگریزی میں لکھی گئی ہے۔" (بمبئی گزٹ بابت ۲۱ جولائی ۱۸۸۳ء)

جرنل آف دی انجمن پنجاب نے دو نمبروں میں اس کتاب پر بہت بڑا ریویو لکھا ہے اور اس میں لکھتا ہے کہ مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ شرع و مذہب اسلام کا بہت بڑا عالم ہے"

مولوی انوار الحق صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھ سے سید محمود مرحوم کا خط مولوی چراغ علی کے نام دیکھا جس میں سید محمود نے مولوی صاحب مرحوم کی وسیع معلومات اور ان کی انگریزی دانی اور انگریزی تحریر کی بڑی تعریف کی تھی۔

علاوہ مذہبی تصانیف کے جن کا ذکر مفصل طور پر الگ کیا جائے گا یہاں ان کی بعض تالیفات

کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو انہوں نے سرکاری تعلق اور حیثیت سے لکھیں یہ سب انگریزی زبان میں ہیں۔

(۱) بجٹ (موازنہ) سب سے اول مولوی چراغ علی مرحوم نے تیار کیا۔ اگرچہ موازنہ اب کچھ کا کچھ ہوگیا ہے اور خاصا ایک دفتر ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کا یہ قول ہے کہ جو اختصار اور صفائی اس موازنہ میں پائی جاتی ہے وہ موجودہ موازنہ میں نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آجکل موازنہ کی ترتیب میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے لیکن "بمصداقِ الفضل للمتقدم" فضیلت کی دستار مولوی صاحب مرحوم کے ہی سر رہے گی۔

(۲) اڈمنسٹریشن رپورٹ (رپورٹ نظم ونسق بابت ۸۵-۱۸۸۴ء) لکھی جو چھ سو بتیس بڑے بڑے صفحوں پر ہے۔ اس قسم کی پہلی رپورٹ ہے اور بعد ازاں جتنی رپورٹیں لکھی گئیں وہ سب اسی کی پیروی میں لکھی گئیں۔

(۳) حیدرآباد دکن انڈر سر سالار جنگ۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور ریاست کی انتظامی حیثیت سے نہایت قابل قدر اور بے مثل کتاب ہے۔ مولوی صاحب مرحوم نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر بحث اس میں تمام انتظامات اور اصلاحات سے ہے جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں عمل میں آئیں لیکن جس انتظام اور صیغے پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اسے ابتدا سے لیا ہے اور اس کی اصل تغیرات، وجہ تسمیہ اور تاریخی حیثیت وغیرہ کو محققانہ طور سے بیان کیا ہے اور اس کے متعلق تمام مواد اور اعداد کو گوشواروں کی صورت میں مہیا کر دیا ہے، علاوہ اس تاریخی حیثیت کے ساتھ ساتھ ممالک محروسہ سرکار عالی کا مقابلہ آس پاس کے صوبہ جات سے بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھے بغیر کوئی شخص حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ حالت انتظامی سے پورا واقف نہیں ہوسکتا خصوصاً جن لوگوں کے ہاتھوں میں انتظام کی باگ ہے انہیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری بلکہ لازمی ولابدی ہے۔ اس کتاب کو مولوی صاحب مرحوم نے نواب سر سالار جنگ کے نام سے معنون کیا ہے۔ اگرچہ کتاب نواب صاحب مرحوم کے زمانے میں آپ کی اجازت سے لکھنی اور چھپنی شروع ہوگئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کے اختتام سے قبل ہی راہی ملک بقا ہوگئے۔ بعد میں فاضل مؤلف نے اپنی احسانمندی کے اظہار میں نواب صاحب مرحوم کے نام اسے منسوب کیا۔ انگریزی اخبارات نے اس پر بہت عمدہ عمدہ ریویو کئے ہیں اور فاضل مؤلف کی محنت وتحقیق کے داد دی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ اپنے نمبر مؤرخہ ۴ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب کے تاریخی اور اعدادی حصے میں بڑی محنت اور احتیاط

صرف کی ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ وہ حصہ ہے جس میں موجودہ نظم و نسق کی کیفیت درج ہے، اس میں متجسس ناظرین ان مختلف محکموں اور سررشتوں کے طرزِ عمل اور حقیقت کو دیکھیں گے جو سر سالار جنگ کی بدولت ایسے وقت میں ظہور میں آئے جب کہ بے عنوانی اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ اور انھوں نے نظم و ترتیب کی صورت قائم کی۔"

اسی طرح اس وقت کے پریذیڈنٹ "مسٹر کارڈری نے اپنے خط مورخہ ۷ / اکتوبر ۱۸۸۴ء میں جو مولوی صاحب مرحوم کے نام ہے، اس کتاب کی بہت تعریف لکھی ہے۔

اسی کا ایک ضمیمہ صرف خاص انڈر سر سالار جنگ ہے جس میں ان اصلاحات و ترقیات کا ذکر ہے جو سر سالار جنگ کی تدبیر و دانشمندی سے علاقہ صرف خاص میں عمل میں آئی۔

(۴) جاگیرات و جاگیرداران۔ افسوس یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس میں تمام جاگیرداران ممالک محروسۂ سرکاری عالی کی اصل اور تاریخ، ان کا رقبہ اور آمدنی، پیداوار، حرفت و صنعت، اور دیگر تمام دلچسپ اور مفصل حالات درج کریں لیکن اس کے لئے مواد بہم پہنچانے میں بہت دقت پیش آئی۔ یہاں کے جاگیردار صاحبان مولوی صاحب کے اس کام کو غالباً شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور مراسلوں کے جواب میں حوصلہ شکن تساہل سے کام لیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ مرحوم کی زندگی میں یہ کتاب ختم نہ ہونے پائی۔ اور ان کے بعد جو لوگ عہدۂ فنانشل سکرٹیری پر ان کے جانشین ہوئے ان میں سے نہ کسی کو اس سے دلچسپی تھی اور نہ اتنی فرصت کہ اس کام کو انجام تک پہنچاتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو نہ صرف دلچسپ ہوتی بلکہ بہت سی عمدہ معلومات کا خزانہ ہوتا جو گورنمنٹ اور ملک دونوں کے لئے مفید ہوتا۔

غرض مولوی چراغ علی مرحوم نہ صرف بحیثیت ایک مصنف کے بلکہ بحیثیت ایک عام انسان کے بھی عجیب و غریب شخص تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے میں اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے، اور چونکہ تقریباً ہر شخص سے جدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لئے بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان کی صحیح طور پر قدر کرسکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش تھے دوسرے انھیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی وہ ایسی بیش بہا شے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے عام طور پر لوگوں

سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوائے دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا، اور نہیں ٹلتا تھا تو بہت جز بز ہوتے تھے، کبھی اخبار اٹھالاتے، کبھی کتاب پڑھنے لگتے۔ عام طور پر بہت کم سخن تھے بہت اختصار کے ساتھ اپنا مطلب ادا کرتے تھے اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے، مثلاً اگر کسی بچہ نے کسی پودے کی نسبت پوچھا تو آپ پورا حال اس پودے کا اور پودوں کی نشو و نما اور آب و ہوا اور زمین کے اثر کا بیان کر دیتے اور ان چھوٹی چھوٹی مگر مشکل باتوں کو نہایت صفائی کے ساتھ سمجھاتے تھے لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن، خیال کے ظاہر کرنے میں جو بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہے وہ بڑے ہو کر نہیں رہتی۔ بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ ادب و لحاظ مانع ہوتا ہے، پھر مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا خوردی و بزرگی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے زیادہ پیارے ہوتے ہیں اور اگر کوئی بتانے والا ہو تو اس وقت انھیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی بہت سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپیہ پیسہ کی بالکل محبت نہیں تھی بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے، نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کسی معاملے میں ان سے باز پرس کرتے اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے، بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے ان کی کوئی بیش بہا چیز توڑ ڈالی، خفا ہونا تو درکنار انھوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیونکر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔ مولوی صاحب مرحوم کے بھتیجے مولوی محمد علی صاحب جو نیک سیرتی اور سادگی میں اپنے والد مرحوم اور چچا کی یادگار ہیں، راقم سے فرماتے تھے کہ رات کا کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ جب ہم نے انھیں کام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر سوئے پھر اٹھ کر لکھنے یا پڑھنے بیٹھ گئے اور پھر سو گئے اور اس کے بعد کیا دیکھتے ہیں، کہ کسی دوسرے کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ چونکہ ذیابیطس کی شکایت تھی پانی زیادہ پیتے تھے، اور یوں بھی رات کے وقت اکثر وہ کام کرتے رہتے تھے، لیکن کبھی کسی نوکر کو نہ بلاتے اور خود ہی سب کام کر لیتے تھے۔

غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن خاموش طبع، فلاسفر مزاج کوہ وقار عالی خیال شخص تھے۔ کبھی اپنا وقت بے کار ضائع نہیں جانے دیتے تھے۔ ہر وقت مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت میں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے انہیں طبعی نفرت تھی۔ یہ حال غیروں سے ہی نہیں تھا بلکہ بیوی بچوں سے بھی یہی کیفیت تھی۔ سب کی سن لیتے تھے مگر اپنی کچھ نہیں کہتے تھے۔ کبھی کسی سے مناظرہ اور بحث نہیں کرتے تھے، کوئی کچھ کہا کرے انھیں جو کچھ کرنا ہوتا تھا کر گزرتے تھے۔

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ (حالی)

وقار اور متانت ان پر ختم تھی، استقلال میں پہاڑ تھے، آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کبھی نہیں چوکتے تھے، مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اسلام کے سچے حامی تھے، اور اُن کی عمر اور محنت کا زیادہ حصہ اسی میں گزرا۔ ان سے پہلے صرف دو شخصوں نے انگریزی زبان میں یورپین مصنفین کے اعتراضات کی تردید اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی تھیں، ایک تو سر سیدؒ جن کی کتاب "خطبات احمدیہ" کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور دوسرے رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس بحث پر کتابیں لکھی ہیں اس کی اس وقت تک نظیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود ان کے حریف ریونڈ کینن میکال نے ان کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے لیکن باوجود اس کے نہایت بے تعصب تھے اور کسی مذہب و ملت سے انہیں خصومت اور پرخاش نہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ گزشتہ مردم شماری سے قبل جب مردم شماری ہوئی تو انھوں نے مذہب (فرقہ) کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو لفظ شیعہ لکھ دیا لیکن اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیے۔ اس سے ان کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے اور باقی تمام فرقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔

اس موقع پر یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس وقت ہم مولوی صاحب مرحوم کے حالات کی جستجو میں تھے تو ہمیں مولوی صاحب کے کاغذات میں سے چند خطوط مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم

کے بھی ملے جو انہوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پُرزور کتاب "براہین احمدیہ" کی تالیف میں مدد طلب کی تھی۔ چنانچہ مرزا صاحب ایک خط میں کہتے ہیں کہ آپ کا افتخارنامہ محبت آمود ... عزورود لایا۔ اگرچہ پہلے سے مجھ کو بہ نیت الزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثبات نبوت و حقیقت قرآن شریف میں ایک عرصہ سے سرگرمی تھی مگر جناب کا ارشاد موجبِ گرم جوشی و باعثِ اشتعال شعلہ حمیت اسلام علیٰ صاحبہ السلام ہوا اور موجب ازدیاد تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحبِ فضیلتِ دینی و دنیوی تہِ دل سے حامی ہو اور تائیدِ دینِ حق میں دل گرمی کا اظہار فرمادے تو بلا شائبہ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہیئے جزاکم اللہ نعم الجزاء .... ماسوائے اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائج طبع عالی سے جمع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں۔" ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں: "آپ کے مضمون اثباتِ نبوت کی اب تک میں نے انتظار کی پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا، اس لئے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ براہِ عنایتِ بزرگانہ بہت جلد مضمون اثباتِ حقانیت فرقانِ مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا، براہین احمدیہ علیٰ حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں اور اپنے مختصر کلام سے ان کو زیب و زینت بخشوں۔ سو اس امر میں آپ توقف نہ فرماویں اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون فرماویں۔" اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوتِ اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ۔ "دوسری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے اور امید ہے کہ عنقریب آجائے گا اور پنڈت دیانند کی وید بھاشی کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں اور ان کا ستیارتھ پرکاش بھی موجود ہے۔ لیکن تاہم آپ کو بھی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کا جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہوں یا جو وید پر اعتراضات ہوتے ہوں، ان اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتبِ مسلمہ آریہ سماج کی صرف وید اور منواسمرت ہے، اور دوسری کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے۔ بلکہ پُرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں۔ میں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثباتِ نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنود کے وید اور ان کے دین پر بھی سخت سخت اعتراض کئے جائیں

کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلافِ حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو تب تک گو کیسی ہی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے ان پر ثابت کئے جائیں اپنے دین کی طرفداری سے نہیں باز آتے، اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اسی میں گزارہ کر لیں گے۔ گو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ کے کتاب کے اندر درج کردوں گا۔" ایک اور مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں۔ "فرقانِ مجید کے الہامی اور کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعثِ ممنونی ہے نہ موجبِ ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارے میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے گا آپ کی مرضی ہو تو وجوہات صداقتِ قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں تاکہ اسے رسالہ میں حسب موقع اندراج کروں یا سفیر ہند میں.... لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانۂ گزشتہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کا تحریر کرنا ضروری نہیں کہ منقولات مخالفت پر حجتِ قویہ نہیں آسکتیں جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا جو عند العقل اس کی ضرورت ہو تو وہ دکھلائی چاہیئے۔ بہرصورت میں اس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی۔ آپ بمقتضا اس کے الکریم اذا وعدہ وفا مضمون تحریر فرما دیں۔ لیکن یہ کوشش کریں کہ کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے اور آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق دے کہ منکر کتابِ الٰہی کو دنداں شکن جواب سے ملزم اور نادم کر دیں، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ" اس کے بعد ایک دوسرے خط مؤرخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں۔ "کتاب (براہین احمدیہ) ڈیڑھ سو جز کی ہے جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپیہ ہے اور آپ کی تحریر ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائے گی۔"

ان تحریروں سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے مرزا صاحب مرحوم کو براہین احمدیہ کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی ہے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو حمایت و حفاظتِ اسلام کا کس قدر خیال تھا۔ یعنی خود تو وہ یہ کام کرتے ہی تھے مگر دوسروں کو بھی اس میں مدد دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب مولوی احمد حسن صاحب امروہی نے اپنی کتاب تاویل القرآن شائع کی تو مولوی صاحب مرحوم نے بطور امداد کے سو روپے

مصنف کی خدمت میں بھیجے، اسی طرح جو لوگ حمایتِ اسلام میں کتابیں شائع کرتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح امداد کرتے تھے اور اکثر متعدد جلدیں ان کتابوں کی خرید فرماتے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد علی صاحب کی کتاب پیغامِ محمدی کی کئی سو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کر دیں۔

وہ میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے۔ چہرے سے ان کے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی، چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں، اور دیکھنے سے رُعب اور اثر پڑتا تھا۔ ان کے اکثر ہم عصر اور ہم رُتبہ لوگ ان کا بہت احترام اور بہت ادب کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل و صورت کے لوگوں پر ان کے علم و فضل اور قابلیت کا بھی رُعب پڑتا تھا۔

حیدر آباد میں جہاں کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے، اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا اکھڑا ہو جاتا ہے، وہ اس طرح سے رہے جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہوس۔ حالانکہ وہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن کبھی کسی جھگڑے، کسی سازش، کسی پولٹیکل، سوشل تحریک میں ان کا نام نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے، نہ اپنا کوئی جتھا بنایا اور نہ کسی کے جتھے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز خانگی امور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے، وہ ان سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کی توجہ اور ان کا دل کہیں اور تھا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ (حالی)

جو لوگ یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، انہیں مولوی چراغ علی مرحوم کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیئے اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زمین شور میں قبلہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں انھیں مولوی چراغ علی مرحوم کی طرح اس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے نتائج اب تک بار آور ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو (میرؔ)

وفات

اگر صد سال مانی در یکے روز
بباید رفت زیں کاخ دل افروز

مرحوم کو ذیابیطس کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، اب اسی کے اثر سے ایک گلٹی داہنی کنپٹی اور گردن کے درمیان دائرہ کے نیچے نمودار ہوئی۔ ڈاکٹر ہیرا ان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور ڈاکٹر لاری مشہور سرجن و سابق ناظم محکمۂ طبابت سرکارِ عالی کی یہ رائے ہوئی کہ عملِ جراحی کیا جائے۔ اس وقت تک مرحوم بالکل صحیح اور تندرست معلوم ہوتے تھے اور سرکاری کام میں برابر مصروف تھے۔ چنانچہ حسبِ مشورہ باہمی ڈاکٹر لاری نے نشتر دیا۔ اس کے بعد صحت میں یکبارگی فرق آگیا اور ضعف طاری ہوگیا بعد ازاں دو تین بار پھر نشتر کیا گیا اور ہر بار حالت ردی ہوتی گئی اور زہر آلود خون پھیلتا گیا۔ حالانکہ یہ زخم بہت ہی نازک ہوگیا تھا اور پکے پھوڑے سے زیادہ اس میں تکلیف ہوتی تھی، جب ڈاکٹر زخم صاف کرتا اور اسے اندر باہر سے صاف کرکے دھوتا تھا تو مولوی صاحب خاموش اسی طرح بیٹھے رہتے تھے کیا مجال جو زبان سے اُف نکل جائے یا تیور سے کسی قسم کے درد یا تکلیف کا اظہار ہو۔ چونکہ حالت ناقابلِ اطمینان تھی لہٰذا مولوی صاحب اور ان کے اعزا و احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ بمبئی جاکر علاج کیا جائے۔ چنانچہ روز سہ شنبہ بتاریخ ۱۱ جون ۱۸۹۵ء مرحوم مع اہل و عیال کے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حالت بہت ردی ہو چکی تھی، زہر آلود خون جسم میں پھیل گیا تھا حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی، وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے، اور جس سے کوئی جاندار بچ نہیں سکتا آخر آ پہنچا۔ پندرھویں جون روز شنبہ صبح کے آٹھ بجے سے تنفس شروع ہوگیا، اور گیارہ بجتے بجتے دار فنا کا مسافر زندگی کی پچاس منزلیں طے کرکے راہی ملک بقا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔ مرحوم بمبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں، جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے۔ اولاد مرحوم کے بھی ہے یعنی پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں، اور بفضل خدا سب کے سب صحیح سلامت اور بقیدِ حیات ہیں۔ اولاد کس کے نہیں ہوتی، اور کون جاندار ہے جو اس پر قادر نہیں بلکہ جتنے ادنیٰ اور ذلیل جانور ہیں اتنی ہی ان کی اولاد زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ ان کے چند گھنٹے میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں۔ لیکن انسان کا نام اس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا ان کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت

کی وجہ سے ؟ ہرگز نہیں، یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں بلکہ ان کے کیریکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اور ہم کیا یاد کر رہے ہیں اور ان کا کیریکٹر اور ان کا کام ہمیں خود ان کی یاد دلا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم ان کی کتابیں شوق سے پڑھتے، ان کا ترجمہ کرتے اور انہیں یاد کرتے ہیں اور ان کے نیک نام اور کام کی یاد دوسروں کو دلاتے ہیں۔ بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔

مرحوم کی وفات پر تمام اردو انگریزی اخبارات میں اظہارِ افسوس و ملال کیا گیا تھا لیکن ہم یہاں بخوفِ طوالت صرف دو تحریروں کی نقل کرتے ہیں۔ ایک نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم (مدار المہام) کا اظہارِ افسوس جو انہوں نے سرکار کی طرف سے کیا اور جو جریدہ اعلامیہ سرکارِ عالی میں طبع اور شائع ہوا۔ دوسرا سر سیدؒ کا نامۂ الم جو اس دردناک خبر کو سنتے ہی انہوں نے "تہذیب الاخلاق" میں لکھا تھا۔ حقیقت میں یہ دونوں تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں:۔

"مولوی چراغ علی کی وفات سے ریاست کا ایسا بے لاگ، بے لوث، مستقل مزاج، تجربہ کار، عہدیدار جاتا رہا کہ پھر اس کا بدل نہ ملا، ادھر قوم میں سے ایک حامی ملت اور فاضل محقق گم ہو گیا جن مضامین پر مولوی چراغ علی مرحوم نے قلم اٹھایا ہے اس پر اور بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں، اور زمانہ آئندہ اس سے بھی بہتر لوگ پیدا کرے گا۔ لیکن ایسے دھن کے پکے، دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنے کام میں ہمہ تن محو مشکل سے پیدا ہوں گے۔"

(از جریدۂ اعلامیہ احکام سرکار نظام الملک آصف جاہ، جلد بست و ششم نمبر چہل و یکم مطبوعہ ہفدہم امرداد ماہ الٰہی ۱۳۰۴ھ فصلی مطابق سی ام ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ)

"نواب مدار المہام سرکارِ عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال و فینانس سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد ۱۳۰۴ھ فصلی بروز شنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا گئے تھے، انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگزار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدیدار تھے۔ نواب مدار المہام سرکارِ عالی مکرر اظہارِ افسوس

کرتے ہیں کہ طبقۂ عہدیداران میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے سرکار کو درحقیقت بہت نقصان پہنچا۔"

(ص ۲۹۵ نشان ۱۴۴)

(از تہذیب الاخلاق" علی گڑھ سلسلہ سوم جلد دوم۔ مطبوعہ یکم محرم الحرام ۱۳۱۳ھ ہجری)

"افسوس! ہزار افسوس! صد ہزار افسوس! کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتہ کی بیماری میں انتقال کیا۔ ان کا خط ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مورخہ نہم جون مقام حیدر آباد سے ہمارے پاس آیا تھا، جس میں انہوں نے لکھا تھا تین ہفتہ سے بیمار ہوں۔ داڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی ہے ڈاکٹروں نے اس اندیشہ سے کہ مغز میں ورم نہ ہو جائے کلوروفارم کا عمل کر کے کاٹا اور بعد میں پھر دوبارہ کلوروفارم کا عمل کیا۔ بہت ہی کمزور ہو گیا ہوں۔ کھانا پینا نہیں چلنا پھرنا موقوف، مگر اب زخم بھرتا چلا آتا ہے اور ارادہ ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے بمبئی جاؤں۔ اس کے بعد بارھویں جون کا بمبئی سے انہیں کا کا بھیجا ہوا تار ہمارے پاس آیا کہ میں بمبئی آ گیا ہوں۔ افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جب کہ ہم بعض کاغذات ان کے نام روانہ کر رہے تھے اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے اسی وقت انہوں نے بمبئی میں انتقال کیا۔ "مولوی چراغ علی مرحوم ایک بے مثل اور مرنج و مرنجان شخص تھے ہمارے کالج کے ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے۔ حیدر آباد میں سالار جنگ اعظم نے ان کو بلایا تھا، اس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدر آباد میں ہوئے اور پارٹیاں قائم ہوئیں مگر ان کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ ان کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلے کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدر آباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

"متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے مصنف تھے انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست

تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانہ میں کہ ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں، نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون افسوس ہے کہ وہ مضمون اور اس کا لاحل جواب جو انھوں نے "تہذیب الاخلاق" میں لکھنا چاہا تھا، ناتمام رہ گیا اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"

مرحوم کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں ان میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

سید محمود مرحوم (خلف سرسیدؒ) نے بھی جو فارسی صنائع میں تاریخ کی صنعت کو پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی:۔

حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد

۱۸۹۵ء

مولانا حالی مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے:۔

زخمے از مرگ چراغ علی آمد بردل	کہ از و خاطرِ افکار بصد غم شدہ جفت
از خرد سال وفاتش چو بجستم محمود،	"شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا" گفت

مولانا حالی نے خود بھی ایک قطعہ مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام اور کیریکٹر کی کامل تصویر کھینچ دی ہے وہ یہ ہے:۔

آہ آہ! از رحلت بے گاہ اعظم یار جنگ	کز میان رہ رہبراہاں عناں پیچیدہ رفت
حیف دنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع	بزم ما را بزم ماتم باز گردانیدہ رفت
مستفیداں پُر نہ کردہ دامنِ معنی ہنوز	مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشیدہ رفت
از سحاب فیض کلکش ناشدہ سیراب خلق	ساعتے برق یمانی از افق تابیدہ رفت
عقد ہا نکشودہ ماند و نکتہ ہا نوشتہ ماند	ہر جوے شیر کوہ بے ستوں کندیدہ رفت
کرد بے آزارِ خلق اعمال سلطانی ادا	نے زکس رنجیدہ۔ زکس را برنجانیدہ رفت
یاوراں قوم را تا زیست یاور بود و یار	ہر چہ بتوانست در تائید شاں کوشیدہ رفت
از دل پُر درد او گاہے صدائے برنخاست	مدتے چوں بحر کاہل در نہاں جوشیدہ رفت
طبع آزادش بہر ملت کہ بینی صلح داشت	در دل خویش و دل بیگانہ در گنجیدہ رفت

گرزید صد سال کس انجام او مرگست و بس — چوں شرر بر وضع دوراں می تواں خندید و رفت

مولوی محمد اعظم صاحب چریاکوٹی نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانے تک حیدر آباد میں ملازم تھے اور اب وظیفہ یاب حسنِ خدمات ہیں، ایک اچھا قطعۂ تاریخی لکھا ہے۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

آں گرامی معتمد کز حسن رائیش بید رنگ — یافت آرے در دکن مال و خزانہ آب و رنگ

محکم اخلاص دلی با ملتِ اسلام داشت — در معیشت بود رفتارش برآدابِ فرنگ

علم را جوہر شناسے، قدر دانِ اہلِ علم — طالبِ حکمت نگہدارندۂ آئین ہنگ

با علوِ فکرتش مرغِ ہما برکندہ بال — عقلِ کل در مرغزار جودتش، آہوئے لنگ

باسبک روحی متینی بود چوں کوہِ گراں — کلک او در دشت معنی برق رفتارے سرنگ

بہر معنی ہا دلش دریائے گوہر خیز بود — وقتِ گویائی دہانش بود شکر بارِ تنگ

شد نمایاں تاگماں از گوشۂ رخسارِ او — دانہ ریش قضا چیزے کم از قدر شنگ

بارہا از بحرِ اصلاحش بروں نشتر زدند — تا شد از نشتر زنیہا کار بر بیمار تنگ

رفتہ رفتہ شد بس ابتر حال او در چند روز — بود گویا صورتِ تصویر بر پشتِ پلنگ

عاقبت بے وقت مرگ از گلشن گیتی ربود — آں چنانش کز کمیں ساحل نشیناں را نہنگ

الغرض چوں رخت ہستی بست از دنیائے دوں — ہاتفی گفت از جلالی، وائے اعظم یار جنگ

۱۳۱۲ھ

سید محمد داحد علی صاحب کاکوروی نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک سنہ عیسوی میں دوسری ہجری نبوی میں کہی تھیں جو یہ ہیں:۔

۱۔ ہاتفی گفت از سر افسوس — گوہر شب چراغ بود نماند

۱۸۹۵ء

۲۔ ہائے اعظم یار جنگ

۱۳۱۲ھ

مولوی محمدّ عزیز مرزا مرحوم

سنہ ۱۹۱۲ء

آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن ایک ایسے شخص کی موت جس سے دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کی بہبودی وابستہ ہو، جس پر قوم کی رہبری اور سرداری کے لئے ملک کی نظر انتخاب ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں، ہزار حسرت و افسوس کے قابل ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

مرحوم لڑکپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز رہے اور آنرز کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور علی گڑھ کالج کے نہایت قابل اور سعید سپوتوں میں سے تھے۔

طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدر آباد آئے۔ اگرچہ ابتداء میں وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے انھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی، اور مددگاری ہوم سکریٹری سے ہوم سکریٹری کی معزز اور اہم خدمت پر فائز ہوئے، ان کی کاردانی اور کارگزاری ریاست حیدر آباد دکن میں ضرب المثل ہے، وہ کام کرنے میں بجلی، اور محنت کرنے میں آندھی اور طوفان تھے۔ معاملات کی تہہ کو اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں مطالعہ کیا تھا وہ بھی دیکھتے رہ جاتے۔ سرکاری خدمت کو کٹھن اور دشوار منزلوں کو انھوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرا جو کام دوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس

گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے وہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں بھگتا دیا۔ اور پھر اس دقیق نظری کے ساتھ کہ کیا مجال کوئی بات رہ جائے۔ اپنے فرائض نہایت دیانتداری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کئے اور نہ کبھی کام کرنے سے اکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا جب بعض وجوہ سے وہ خدمت ہوم سکریٹری سے اول تعلقداری پر بھیجے گئے تو حالانکہ انھوں نے کبھی مال کا کام نہیں کیا تھا لیکن اپنے فرضِ منصبی کو اس خوبی اور استقلال کے ساتھ ادا کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوئی اور سرکاری رپورٹوں میں متواتر ان کی کارگزاری پر اظہارِ خوشنودی کیا گیا اور ادھر رعایا اس قدر خوش تھی کہ ہندو مسلمان ان کے تبادلے پر آنسو بہاتے تھے۔ اس کے بعد وہ مجلسِ عالیہ عدالت کے رُکن (جج ہائی کورٹ) ہوئے اور باوجودیکہ انھوں نے کوئی قانونی امتحان پاس کیا نہیں تھا لیکن یہاں بھی وہ اپنے کام میں ممتاز رہے۔ تعلیم یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اسے حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ پھر اسی جانگزا اور طمانیت سوز خدمت ہوم سکریٹری پر سرفراز کئے گئے۔ اس زمانے میں مرحوم نے ریاست حیدرآباد کی تعلیم پر خاص توجہ کی اور ایک ایسا قابلِ تعریف نوٹ ریاست کی تعلیمی حالت پر لکھا جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ نیز اس میں ایسی ایسی تجاویز پیش کی ہیں کہ ان پر کافی طور سے عمل کیا گیا تو ملک کی خوش قسمتی سمجھی جائے گی اور جب کبھی ریاست کی تعلیمی حالت پر اصلاح کا خیال پیدا ہوگا تو اسی داغ بیل پر چلنا پڑے گا۔ مرحوم کی ذہانت، قابلیت، وسعتِ نگاہ پر ایک عالم گواہ ہے باوجود کثرت کار کے علمی شوق ان کے دم کے ساتھ رہا۔ ہندوستان کے مشہور اردو رسالوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں ان کے بیش بہا مضامین طبع نہ ہوئے ہوں۔ اور پبلک انھیں ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ مرحوم مقرر بھی تھے، اور بلا تکلف تقریر کرتے تھے لیکن تقریر سے زیادہ ان کی تحریر پُر زور اور شاندار ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے بعض مضامین اردو انشاپردازی کے بہت عمدہ نمونے ہیں۔ مرحوم کو علم تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ محمود گاواں کی سیرت پر جو رسالہ لکھا ہے اس سے ان کے تاریخی تجسس وتلاش کا پتہ لگتا ہے۔ اردو ادب میں بھی انھیں ویسا ہی شوق تھا جو دکرم اروسی (کالی داس کے ڈرامے کا ترجمہ) سے صاف ظاہر ہے۔ ریاست حیدرآباد میں کوئی علمی اور سوشل مجلس اور سوسائٹی ایسی نہ تھی جس کے وہ پریزیڈنٹ یا وائس پریزیڈنٹ نہ ہوں، مثلاً دائرۃ المعارف، نظام کلب، کتب خانہ آصفیہ، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، انجمن اردو وغیرہ وغیرہ سب ان سے فیضیاب تھیں۔ انجمن قائم کرنے والے یا کسی عارضی جلسے کے منعقد کرنے والے اول ہی سے یہ سمجھ لیتے تھے کہ مولوی

عزیز مرزا اس کے صدر رہوں گے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ مرحوم حیدر آباد کی تمام قومی و ملکی اور تمدنی تحریکوں کے رُوحِ رواں تھے اور اس کا سب سے قوی ثبوت یہ ہے کہ جب سے حیدر آباد سے مرحوم گئے ہیں، حیدر آباد جیسا شہر سنسان ہوگیا کسی قسم کی تحریک کا نام زبان پر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس دم کے ساتھ تھا جو خود علمی ذوق اور قومی درد رکھتا تھا۔ اور دوسروں میں اس احساس کی قدر کرتا تھا۔

اس سے بڑھ کر دوسری بات جس نے مرحوم کو عام و خاص، امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ سب میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا ان کی وسعتِ اخلاق تھی۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے یکساں خوش اخلاقی اور بشاشت سے پیش آتے تھے۔ ہر ایک کی بات سنتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، نخوت اور رعونت چھو نہیں گئی تھی، چھوٹے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی وہ مساوات کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کا گھر پبلک کا گھر تھا۔ اور صبح کے ۶ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور باوجودیکہ ان کا کاموں میں ہرج ہوتا تھا اور بعض اوقات تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ ضروری سے ضروری کام کو چھوڑ کر بھی مل لیتے تھے۔ لوگوں کی مقصد براری اور سفارش کرنے میں بڑے دلیر تھے اور کبھی کوئی شخص ان کے در سے مایوس ہو کر نہ گیا۔ ان کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے اور ہر شخص آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔ افسوس کہ ان کے جاتے ہی یہ چرچے حیدر آباد سے اُٹھ گئے اور اب کوئی ایسی جگہ نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے۔ ظریف اور خوش طبع بھی تھے۔ ان کے مزیدار لطیفوں اور چٹکلوں کا ان کے دوست اب تک مزہ لیتے ہیں، ان کی مجلس سے کوئی شخص شاذ و نادر ہی ناخوش اور مایوس ہو کر آتا، مذہب کے بہت پابند تھے۔

کہیں ہوں اور کسی حالت میں نماز قضا نہیں ہوتی تھی، ان کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی باوجود اس جاہ و منصب اور قیام حیدر آباد کے کبھی بھولے سے بھی راحت و عیش کی طرف مائل نہ ہوئے وہ بہت متقی اور پرہیزگار تھے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی طرزِ معاشرت پرانے اور نئے طبقے کے لوگوں کے لئے قابلِ تقلید تھی۔ مرحوم بہت صاف گو تھے جو دل میں آتا فوراً زبان سے کہہ دیتے تھے اور اس صاف گوئی سے انہیں بعض اوقات نقصان بھی پہنچا۔ اگر کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن پھر جلد صاف بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ ان کا فیض عام تھا۔ دوست دشمن بلا امتیاز اس سے متمتع ہوتے تھے۔ انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے ان سے برائی کی انھوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے کیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر انھوں نے

دشمنوں کو نوازا۔ مرحوم بہت رقیق القلب تھے۔ کسی کی درد بھری داستان سن کر خود ان کا دل بھر آتا تھا۔ ان کی تنخواہ کا ایک حصّہ دوسروں کی دستگیری میں صرف ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس کبھی روپیہ جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دنیا سے کوچ کیا۔

حیدرآباد کی زندگی عجیب وغریب زندگی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ یہاں کے اطراف وحوالی کا اثر انسان پر نہ پڑے اور کچھ نہیں تو کاہل تو ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ لیکن مرحوم کی جفاکشی ومستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا۔ وہ کبھی راست بازی اور دیانتداری کے راستے سے نہ بھٹکے۔ ان کی زندگی سادہ وبے ریا جیسی پہلے تھی ویسی ہی آخر دم تک رہی اور ان کے اتقا اور پرہیزگاری میں کبھی تزلزل واقع نہ ہوا۔ لیکن آخر میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا۔ مگر بے عیب ذات خدا کی ہے کون ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور خاصکر یہ ضعف نہ ہو۔ لیکن اس عزیز مرحوم میں اس قدر محاسن اور خوبیاں جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اس کا جانشین نہیں ملتا۔ خصوصاً حیدرآباد میں لوگ انھیں زمانہ دراز تک یاد رکھیں گے۔ ان کی بھلائیاں، ان کے کارنامے اور ان کے احسانات ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

حیدرآباد سے جانے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف کر دی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ان کے سکریٹری ہونے سے قبل لیگ برائے نام تھی۔ مرحوم نے اسے زندہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دورہ کر کے اس کے دائرۂ افادہ کو وسیع کیا اور اہلِ کمال اس کے کاموں کی قدر کرنے لگے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یہ مسلمانوں کی حمایت میں سب سے پرزور آلہ ثابت ہوتے۔

مرحوم کی عمر پورے پچاس برس کی بھی نہ تھی کہ پیام اجل آپہنچا۔ اب تک وہ طالب علمی اور ملازمت کے دھندے میں گرفتار رہے تھے۔ حال میں مکروہاتِ دنیا سے فارغ ہو کر قومی کارزار میں بڑی مستعدی سے قدم رکھا تھا اور یقین تھا کہ وہ سب سے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جب ایام ملازمت میں انھوں نے اس قدر نمایاں کام کئے تو بعد فراغت وہ کیا کچھ نہ کرتے لیکن افسوس کہ عین وقت پر اور نہایت بے وقت انھیں اس دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔ اور ملک وقوم کی بہت سی توقعات اور آرزوئیں ان کے ساتھ خاک میں مل گئیں۔

جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں پر ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں اب تک کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے پرانے بزرگوں کی طرح ملک و قوم کی خدمت بے نفسی اور ہمدردی کے ساتھ کی ہو۔ یہ اعتراض بہت کچھ صحیح ہے اور اکثر اس کے جواب میں ہمیں ساکت ہونا پڑا۔ لیکن اب ہم بلا خوف تردید مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کو پیش کرتے ہیں جو بالکل جدید تعلیم یافتہ تھے۔ مگر ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جن کی ملک و قوم کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ ایام طالب علمی و ملازمت میں وہ جہاں کہیں رہے انھوں نے اپنے فرض منصبی کو ایسی مستعدی و جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہو گئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو اسے بھی خوش اسلوبی، بے نفسی اور بے ریائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کر دیا کہ حبِّ وطن اور قومی درد کسی خاص طبقے یا کسی خاص عمر پر موقوف نہیں ہے ؎

قیس ہو کوہکن ہو یا حالؔی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

شمس العلماڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی مرحوم

۱۹۱۲ء

شمس العلماڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی مرحوم ہندستان کے عہد جدید کے ان نامور علمار میں سے ہیں جنھوں نے علم دالسنہ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدن، علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت جدید تعلیم کے رہبر و رہنما ہیں اور ان کے متعلق وہ شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی جو اس وقت انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے متعلق عام طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قدیم علوم تہذیب سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں جس سے حمیت قومی میں ضعف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ اس نقص کی طرف بہت جلد مبذول ہو گئی جس کی اصلاح کی ہر طرف کوشش کی جارہی ہے۔

مرحوم بلگرام کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے اور یہ خاندان مسلمانوں کے ان معدودے چند خاندانوں میں سے ہے جنھوں نے ایسے زمانے میں جب کہ ہند میں مختلف قوتیں کام کر رہی تھیں اور باہمی کشمکش سے ملک میں بے اطمینانی تھی زمانے کا رخ پہچانا اور عاقبت اندیشی اور دوربینی سے کام لے کر ادھر کو چلے جدھر زمانہ جارہا تھا اور جس کے آگے آخر سب کو جھکنا پڑا۔

ان کے آبا و اجداد شہر واسط میں جو عراق عرب میں بغداد و بصرہ کے درمیان واقع ہے چھٹی صدی میں ہندوستان آئے اور اودھ میں مقیم ہوئے۔ ان کے جد امجد مولوی سید کرامت حسین خاں بہادر دوالسرائے کے دربار میں شاہ اودھ کی طرف سے قایم مقام تھے۔ بعد الحاق ان کے والد اور چچا دونوں انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ اور معتبر خدمات پر سرفراز ہوئے۔

ان کے چچا سید اعظم الدین حسن خاں لارڈ ولیم بنٹنک کے مصاحب (اے ڈی۔ سی) اور اورنٹیل انٹرپریٹر (ترجمان السنہ مشرقیہ) تھے اور بعد میں سندھ میں پولٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے اور دریائے سندھ کی نگرانی بھی انہیں تحویل کی گئی۔ یہ ایسی باوقعت اور اہم خدمت تھی کہ سوائے انگریز کے کسی دوسرے کو ملنی محال تھی، لیکن چونکہ امیران سندھ اپنے ہاں انگریز کا آنا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے اعظم الدین خاں کا انتخاب کیا گیا' جس سے ان کی وقعت اور قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آنریبل نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) بر سبیل تذکرہ فرماتے تھے کہ جب اہل سندھ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سید ہیں تو ان کے بنگلہ پر جو دریا کے کنارے تھا لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور بوجہ خوش اعتقادی بے انتہا حرمت و توقیر کرتے تھے' اور بیماروں کے لئے تعویذ مانگنے آتے تھے۔ چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ فرصت کے بعد عربی کے اشعار یا قرآن کی آیات جو اس وقت یاد آتیں کاغذ کے پرچوں پر لکھ لکھ کر ٹوکرے میں ڈالتے جاتے تھے اور دوسرے روز لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے اور ان میں سے اکثر اچھے بھی ہو جاتے تھے۔ انگریزی خوب جانتے تھے لیکن جب تک وہاں رہے کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھی تاکہ لوگ بدگمان نہ ہو جائیں، مگر بدگمانی سے نہ بچ سکے چونکہ بہت وجیہہ، گورے چٹے تھے لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ دراصل یہ انگریز ہے لیکن مسلمان بنا ہوا ہے اس لئے وہاں عام طور پر بدظنی پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ جان سے مار ڈالنے کی سازش کی گئی۔ انہیں بھی اس کی اطلاع ہو گئی اور یہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ دو بار بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور اسسٹنٹ افسر (افسر بندوبست) رہے دیسی طبقہ میں سی۔ ایس۔ آئی۔ کے پہلے گروہ میں سے تھے۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے آرہ ہاؤس کے بچانے میں کنور سنگھ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور مشہور آرہ گاریسن ہاؤس کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم کے والد سید زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری اور ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدے پر مامور رہے اور ۱۸۴۰ء سے ۱۸۷۵ء تک اپنی خدمات کے فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اور پنشن پانے کے بعد ریاست حیدرآباد میں کمشنری انعام کی خدمت پر تقرر ہوا۔

مرحوم کے چچا اور والد مشرقی علوم والسنہ کے عالم اور فاضل تھے اور بعد ازاں انھوں نے مدرسہ عالیہ میں جو وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں قائم کیا تھا تعلیم پائی۔ ہندوستان میں یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے

باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔

مولوی سید علی مرحوم اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، ۱۰ر نومبر ۱۸۵۱ء میں تولد ہوئے۔ آٹھ برس کے سن سے چودہ برس تک علوم عربیہ حاصل کئے، کہتے ہیں کہ حافظہ ان کا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی لکیر تھی پندرہ سال کی عمر میں عربی فارسی تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی انہوں نے خوب ترقی کی۔ دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں شریک ہوئے اور ۱۸۷۴ء یعنی کل آٹھ سال میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

بی۔ اے میں اُن کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ کالج کے مدرس اور پروفیسر مرحوم کی ذہانت، قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔ اس کے بعد تین سال تک قانون ملکی کا مطالعہ کیا اور سال بھر بعد امتحان نیٹو سول سروس میں کامیاب ہوئے اور کل صوبہ بہار میں اول رہے۔ بعد ازاں طامسن اسکالر شپ پاکر دہ رُڑکی کے انجینیرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ ابھی پورے چھ مہینے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ حیدرآباد دکن کے نامور مدبر اور عالی دماغ وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے جن کی قدر شناسی اور جوہر شناسی مشہور آفاق ہے انہیں حیدرآباد میں طلب کر کے اپنے پرسنل اسٹاف میں داخل کیا اور ولایت جاتے وقت اپنے ساتھ لے گئے اور لندن کے شاہی مدرسۂ معدنیات میں داخل کر دیا۔ اور تین سال میں ایسوشی ایٹ کا امتحان بدرجۂ اعلیٰ پاس کیا اور علم طبقات الارض میں، (مرچی سن) تمغہ پایا علاوہ اس کے کیمسٹری، طبعیات، میکانک، نقشہ کشی، معدنیات علم الحیواۃ وغیرہ علوم میں دستگاہ وافر حاصل کی۔ پروفیسروں نے ان کی لیاقت و ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور اعلیٰ درجہ کے صداقت نامے دیئے ہیں۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے بزمانۂ قیام انگلستان ایسے ماہرینِ فن اور علمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ مثلاً پروفیسر ہکسلے، پروفیسر جڈ، پروفیسر گتھری، پروفیسر ٹنڈل وغیرہ جو ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ اس سے قبل انھوں نے ۱۸۶۹ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان میٹریکولیشن بدرجۂ اعلیٰ پاس کیا تھا اور اس امتحان میں ان کی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا اور امالی زبانوں اور علوم کی تحصیل کے لئے کچھ مدت اٹلی میں قیام کیا اور اس طرح علوم مشرقی و مغربی سے بہرہ ور ہو کر حیدرآباد

واپس آئے۔ جہاں سرکار عالی نے انھیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا۔ کچھ عرصے کے لئے وہ ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم اور ہوم سکریٹری بھی رہے۔

مرحوم مختلف السنہ و علوم کے فاضل تھے اور لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی فارسی، اردو سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی زبانیں خوب جانتے تھے مرحوم پہلے مسلمان تھے جو بار بار مدراس یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے کے سنسکرت کے ممتحن مقرر ہوئے اور ویدوں اور ویدک علم ادب میں امتحان کے پرچے مرتب کئے۔ میں نے کئی پنڈتوں سے یہ سنا کہ ان کا تلفظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے سے وید پڑھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا پنڈت پڑھ رہا ہے۔ اور یہ تو ہم نے خود دیکھا ہے کہ وہ جرمنی فرانسیسی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ نہایت روانی کے ساتھ بلا تکلف پڑھے چلے جاتے تھے۔

مرحوم آخر عمر تک (باستثنائے بعض عارضی تقررات کے) معتمد تعمیرات و ریلوے معدنیات رہے۔ سر آسمان جاہ بہادر مرحوم کی وزارت میں بعض انقلابات سے بددل ہو کر انھوں نے امتحان وکالت کی تیاری اس وقت کی جب کہ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی۔ ایل میں صرف چار مہینے باقی رہ گئے تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس امتحان میں تمام یونیورسٹی میں اول رہے، اور طلائی تمغہ، یونیورسٹی لا اسکالرشپ، اور رچی انعام کتب حاصل کیا اس سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں کسی مسلمان طالب علم کو قانونی امتحان میں یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ امتحان انھوں نے سنہ ۱۸۹۱ء میں پاس کیا۔ اس سے مولوی سید علی مرحوم کے خداداد حافظہ اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ ہند نے انہیں شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا اور بلاشبہ وہ اس کے مستحق تھے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں بعض پولٹیکل وجوہ سے ایک بیش قرار وظیفہ (ہلسار ماہانہ) لے کر خدمت سے علیحدہ ہو گئے اور انگلستان میں جا کر مقیم ہوئے سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہو گئے، اسی سال انڈیا آفس میں عربی و فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور ہوئے، یہ بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ جس کی تعداد چھ ہزار سے کم نہیں۔ اس کی فہرست ترتیب دینا معمولی کام نہ تھا بلکہ ایک بڑا اور اہم کام خیال کیا گیا تھا۔ انڈیا آفس لائبریری کا یہ حصہ دہلی مینوسکرپٹ (قلمی نسخہ ہائے دہلی) کے نام سے مشہور ہے، یہ دہلی کا شاہی کتب خانہ تھا جو غدر کے بعد لندن بھیج دیا گیا۔

شاہجہاں نے پورب کو شیراز کہا تھا لیکن پورب میں بلگرام کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ عجیب مردم خیز خطہ ہے۔ اسی قصبہ میں سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس علامہ سید عبدالجلیل و مولانا آزاد وغیرہم جیسے فاضل پیدا ہوئے اور آخری دور میں شمس العلماء مولوی سید علی مرحوم اور ان کے بڑے بھائی سید حسین نواب عماد الملک بہادر سی ایس۔ آئی کا شمار بھی انھیں باکمال علماء میں ہوسکتا ہے۔

مولوی سید علی مرحوم بلاشبہ علوم و السنہ کے عالم تھے لیکن جب ان کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعًا جفاکشی اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے، دوسرے دکن کی آب و ہوا اور خاصکر یہاں کے حالات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ آدمی کرتا بھی ہو تو کچھ نہ کرسکے اور خاصکر علمی کاموں کے لئے زیادہ راس بھی نہ تھے۔ یہ سرزمین آج نہیں بلکہ صدہا سال سے کچھ ایسی انقلاب انگیز واقع ہوئی ہے کہ ہر دور میں ایک نہ ایک طوفان بپا رہا ہے۔ گو اب جنگ و جدل کا زمانہ نہیں رہا، طوائف الملوکی اور غارت گری کا دور ختم ہوچکا ہے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسا شگوفہ نکل آتا ہے کہ چین سے بیٹھنا اور اطمینان سے کام کرنا نصیب نہیں اور خصوصًا مرحوم کی سی بے چین اور متلون طبیعت کے لئے اس دلدل سے نکلنا بہت دشوار تھا۔ لیکن باوجود اس کے مرحوم علمی کام کی طرف سے غافل نہ رہے، اگرچہ ان کا کام زیادہ تر بلکہ کل کا کل ترجمہ ہی تک رہا۔ لیکن اس زمانے میں بہ نسبت ناقص اور فضول تالیف و تصنیف کے غیر زبانوں کی عمدہ تصانیف کا ترجمہ بسا غنیمت اور قابلِ قدر ہے کیونکہ ہندستان کی خاص کر مسلمانوں کی اس وقت جیسی کچھ حالت ہے اسے مد نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ علمی بیداری کا پہلا دور ترجمہ ہی ہے۔ اگر غیر زبانوں کی علمی اور اعلیٰ تصانیف کے ترجمے ہوجائیں تو آئندہ دور کی تالیف و تصنیف کے لئے بیش بہا سرمایہ اور پیش خیمہ ہوگا یہاں ہم مرحوم کی تالیفات و تراجم کی فہرست پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ مڈیکل جورس پروڈنس یعنی اصول و قوانین متعلق بہ طب۔ یہ کتاب علاوہ اطباء و وکلاء اور حکام عدالت کے عام ناظرین کے لئے بھی بہت دلچسپ ہے (ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے) اس کتاب میں انسانی فطرت کے تاریک پہلو کو پڑھ کر بڑی عبرت حاصل ہوتی ہے۔ بہ زمانۂ وزارت سر آسمان جاہ مرحوم سرکار نے مترجم کو چھ ہزار روپیہ بطورِ صلہ عنایت فرمائے۔ اس کتاب میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ علمی اصطلاحات کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔

۲۔ رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ۔ اس میں مرحوم نے مشہور و معروف کتاب کلیلہ و دمنہ کے متعلق بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور اس امر کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں یہ کتاب کہاں کی ہے، پھر کہاں کہاں گئی اور کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور کیا کیا تغیرات عمل میں آئے۔ مرحوم کی یہ مختصر تالیف بہت دلچسپ اور قابلِ قدر ہے۔ اسے مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں پڑھا تھا مرحوم فرماتے تھے کہ بزمانہ قیام لندن ایک علمی سوسائٹی میں مسلمانوں کے تمدن و علم و ادب کا ذکر تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق اپنی اپنی رائے دے رہا تھا، اسی امر میں مرحوم نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے تمام آثار اور ان کے کارنامے دنیا سے نابود بھی ہو جائیں اور دو کتابیں کلیلہ و دمنہ اور الف لیلیٰ باقی رہ جائیں تو ان کے کارہائے نمایاں کے لئے کافی ہیں، مرحوم کا ارادہ تھا کہ کلیلہ و دمنہ کی طرح ایک رسالہ الف لیلیٰ پر بھی لکھیں اور اس کے لئے دو الماری بھر کتابیں بھی جمع کی تھیں۔

۳۔ فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

۴۔ غارہائے الورہ گائڈ۔

۵۔ حیدر آباد کے اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات۔

۶۔ تمدن عرب۔ موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ جو ہندستان میں بہت مقبول ہوا۔ درحقیقت یہ کتاب عربی و اسلامی تمدن پر بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔

۷۔ "تمدن ہند"۔ یہ کتاب بھی موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا مفصل ذکر اس کے دیباچے کے دوسرے حصہ میں کیا گیا ہے۔

۸۔ مرحوم نے موسیو سدیو کی کتاب تمدن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اُردو میں کیا تھا لیکن جب انھوں نے یہ سنا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو گیا ہے تو اس کو طبع نہیں کرایا۔ حالانکہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا اس لئے کہ عربی میں کامل کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا بلکہ صرف اس کا خلاصہ شائع کیا گیا ہے۔

مرحوم نے حیدر آباد سے ایک عربی سہ ماہی رسالہ "الحقائق" نامی ۱۸۸۹ء میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے۔ اس رسالے میں اچھے اچھے مضمون لکھے گئے۔ لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بہادر مرحوم مولوی سید حسین بلگرامی، علامہ مولوی سید علی شوستری، ڈاکٹر لائٹنر، مولوی سید کرامت حسین صاحب جج الہ آباد جیسے فاضل اور عالم لوگ تھے لیکن افسوس ہے کہ استقلال کے

ساتھ کام نہ ہوا اور رسالہ کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اب بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہندوستان اور دیگر ممالکِ اسلامی میں تعلقات و روابط قائم رکھنے اور ایک کو دوسرے کے خیالات و حالات سے آگاہ کرنے کا ذریعہ عربی زبان ہی ہو سکتی ہے نیز یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آئندہ اسلام کی ترقی و عروج میں عربی زبان کو بڑا دخل ہوگا اس لئے کہ اس وقت مختلف اسلامی ممالک میں باوجود موجودہ انحطاط و انتشار کے باہمی اتحاد و ہمدردی قائم رکھنے والی علاوہ دیگر اسباب کے ایک عربی زبان بھی ہے اور آئندہ چل کر بکھرے ہوئے شیرازہ کو بھی یکجا کرنے میں مدد دے گی۔

اپنے زمانہ ملازمت میں مرحوم نے ایک بہت قابل قدر کام کیا تھا اور اگر وہ جاری رہتا اور قاعدے سے چلایا جاتا اور اس کا چلانے والا ایسا شخص ہوتا جس کے دل میں علمی ترقی اور قومی ہمدردی کی آگ ہوتی تو وہ برکت و خیر کا باعث ہوتا، مرحوم نے سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدرداں امیر تھے، ایک سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے۔ مرحوم اس سررشتہ کے نگراں مقرر ہوئے اور ان کی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لئے کوئی مناسب شخص انھیں نہ ملا تھا لہٰذا انھوں نے شمس العلماء مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم سررشتۂ علوم و فنون پر بمشاہرہ ؟؟؟ ہوا اور حقیقت میں یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اس سلسلے میں شائع ہوئیں لیکن ملک کی بدنصیبی سے یہ سررشتہ ٹوٹ گیا اور کام اب تک بند ہے۔ جس ضرورت سے یہ سررشتہ قائم ہوا تھا وہ اب تک باقی ہے اور جب سے شمالی ہند و دیگر ملک کے حصص میں اردو پر لے دے ہوئی ہے، یہ ضرورت اور نمایاں طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بعد اردو کی سرپرستی دو مقامات پر خاص طور پر ہوئی، ایک تو پنجاب میں، دوسرے حیدرآباد دکن میں، پنجاب میں اس کے بانی ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائڈ تھے، ان صاحبوں کی تحریک سے پنجاب یونیورسٹی نے بیش بہا اور گرانقدر انعامات کے ذریعہ بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو زبان میں لکھوائیں اور ترجمہ کرائیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری رہا۔ لیکن حال میں اس عام مرض کی وجہ سے جو ملک کی بدقسمتی سے ہر جگہ عام ہو گیا ہے بعض حضرات نے وطن پرستی کے پردے میں پنجابی کے پردے میں اردو کو حریف بنا کر لا کھڑا کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی نے اردو کی سرپرستی سے کسی قدر اپنا ہاتھ روک لیا ہے

اب اردو کو صرف دولتِ آصفیہ کا سہارا رہ گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کو علاوہ اس کے کہ دکن نے اس کی نشوونما میں ابتدا سے بڑا حصہ لیا ہے اور مختلف وجوہ سے بھی دولتِ آصفیہ پر بہت بڑا حق حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرکارِ عالی نے عربی، فارسی، اردو تصانیف کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور اب بھی جاری ہے لیکن خاص اصول اور جوش کے ساتھ یہ کام اب تک نہیں ہوا ہے۔ اب کہ سب طرف سے مایوسی ہے سرکار عالی کا یہ فرض ہے کہ اس مسئلہ پر غور کر کے اس مفید اور ضروری کام کو اصول کے ساتھ چلایا جائے اور نہیں تو کم سے کم پنجاب یونیورسٹی کی طرح متعدد بیش قیمت انعامات مقرر کر کے عام طور پر اشتہار دے اور علمی کتابیں اردو میں لکھوائے یا ترجمہ کرائے، تاکہ مؤلفین و مترجمین کی ایک حد تک حوصلہ افزائی ہو سکے اس پر توجہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی پبلک میں اس قدر قدر شناسی کا مادہ پیدا نہیں ہوا کہ مصنفین و مؤلفین اس کے بھروسے پر بڑے بڑے کام کر سکیں اور اس لئے ضرورت ہے کہ ایک زمانے تک اس کے سر پر حکومت و دولت کا ہاتھ رہے۔

مرحوم کو کتابوں کا حد درجہ شوق تھا چنانچہ ایک نہایت عمدہ کتاب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یوں تو تقریباً ہر فن اور علم کی کتاب ہے لیکن خاصکر وہ تمام مطبوعات جو یورپ میں اسلامی علوم و ادب پر اس زمانے میں شائع ہوئی ہیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کی ہیں اور صرف ان کتابوں ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں کے وہ موقت الشیوع رسالے بھی جمع کئے ہیں جن پر اسلامی مباحث پر عمدہ عمدہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اسلامی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کسی دوسری جگہ ایسا بے بہا مجموعہ موجود نہیں۔ کاش کوئی خدا کا بندہ جس کے دل میں درد ہو یہ کتاب خانہ خرید کر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی نذر کر دے تاکہ کالج جب حقیقی یونیورسٹی بن جائے تو یہ اس کے لئے باعثِ رونق و افادہ ہو اور اس محسن کو زندگی جاوید حاصل ہو۔

مرحوم ہمیشہ عمدہ اور نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ چنانچہ کتاب الوصایا لابی حاتم السجستانی کا قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبدالقادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے کیمبرج یونیورسٹی کے کتاب خانہ میں فرانس کے کسی عالم نے بغرضِ طبع طلب کیا کیونکہ دنیا میں اس کتاب کا کوئی اور نسخہ نہیں ہے۔ جب کتاب کتب خانہ کی الماری سے نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئی ہے کہ فرانس پہنچتے پہنچتے آٹا ہو جائے گی۔ تو یہ رائے قرار پائی کہ اس کا فوٹو لیا جائے۔ چنانچہ دس کاپیاں

بذریعہ فوٹو لی گئیں۔ مرحوم کے ولایت پہنچنے سے چار روز پہلے سب کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں مرحوم کو جب معلوم ہوا تو اس پروفیسر کے پاس پہنچے جس نے فوٹو لیا تھا اور بمنت اصرار کیا کہ ایک نسخہ مجھے بھی عنایت ہو۔ پروفیسر موصوف نے عذر کیا کہ اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں سوائے ایک کتاب کے جو میرے ذاتی کتاب خانے کے لئے ہے مگر آپ چونکہ مجھ سے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں لہٰذا وہ نسخہ آپ کی نذر کرتا ہوں، چنانچہ وہ نسخہ اب تک مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے اس کی جلد بھی بہت قیمتی ہے۔

مرحوم نے جمہرۃ اللغہ لابن درید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانچسو روپیہ میں خریدی۔ ان کے ایک معزز دوست جو حیدرآباد میں ایک اعلیٰ خدمت پر تھے ان سے مستعار لائے اور کچھ عرصہ بعد کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں ڈیڑھ دو ہزار کو فروخت کر دی، مرحوم بھول بھال گئے تھے، چار سال بعد جو ایک روز کتب خانہ میں آئے اور کتاب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ میں بھی موجود ہے دیکھنے کے لئے طلب کی تو معلوم ہوا کہ یہ نسخہ تو انھیں کا ہے اور جب اس کے فروخت کی کیفیت سنی تو بہت رنج ہوا آخر بڑی احتیاط سے اس کی ایک نقل لی اور جب برلن گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی۔ اسے بے حد پسند آئی چونکہ روپیہ کی ضرورت تھی لہٰذا پندرہ ہزار میں فروخت کر دی۔

تزک بابری کا کامل نسخہ اب تک دنیا میں طبع نہیں ہوا، اصل ترکی نسخہ ایک سینٹ پیٹرز برگ میں ہے اور دوسرا فرانس میں لیکن دونوں ناقص ہیں، مرحوم نے ترکی تزک کامل کا نسخہ نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم کے کتب خانہ میں دیکھا اور وہ اسے انگلستان جاتے وقت اپنے ساتھ لیتے گئے۔ یورپ کی علمی سوسائٹیوں میں جب تزک کا ذکر آیا تو مرحوم نے اس قلمی نسخہ کو پیش کیا۔ بعد مقابلہ اور تحقیق کے یہ ثابت ہوا کہ سوائے اس نسخے کے باقی جس قدر نسخے دنیا میں اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں ناقص ہیں چونکہ تصحیح کے لئے متعدد نسخوں کا ہونا ضروری ہے اور اس میں تاخیر بھی بہت ہوتی لہٰذا یہ قرار پایا کہ گب میموریل فنڈ کی طرف سے کل کتاب کا فوٹو لے لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ تمام کیفیت عکسی نسخہ میں درج ہے، چونکہ اس زمانے میں جاگیر نواب سر سالار جنگ مرحوم محکمۂ مالگزاری میں تھی۔ حسّاد نے محکمۂ مالگزاری میں یہ شکایت کر دی کہ مولوی سید علی ایک نایاب کتاب کتب خانہ سے لے گئے ہیں ان کو لکھا جائے یا تو کتاب واپس کریں ورنہ ان کے وظیفہ سے اس کی قیمت وضع کر لی جائے۔ چنانچہ محکمۂ مالگزاری کی طرف سے یہی لکھا گیا۔ مرحوم نے اس جواب میں اصل نسخہ اور ایک جلد اس کے عکسی نسخہ کی معتمد مالگزاری کی

خدمت میں بھیج دی اور لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب کا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اسے زندہ کر دیا ہے۔

مرحوم کو ابن عرب شاہ مصنف تاریخ تیموری کی ایک دوسری نادر الوجود کتاب جو مصر کی تاریخ پر مشتمل تھی ولایت میں دستیاب ہوئی۔ مرحوم نے اسے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں طبع کرانا شروع کیا لیکن دوران طبع میں وجع مفاصل مرض لاحق ہو گیا اور اسی وجہ سے وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

مرحوم کو اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیل علم کے لئے سہولتیں پیدا کی جائیں، ایک مرتبہ ان کی رائے ہوئی کہ حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون کی ترتیب بدل دی جائے موجودہ کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتاب کتب کے حروف تہجی پر تقسیم کی گئی ہے۔ اس ترتیب میں یہ خرابی ہے کہ جب تک کوئی پوری کتاب نہ پڑھے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فلاں مصنف کی اس میں کون کون سی کتابوں کا ذکر ہے اور کن کن مقامات پر ہے۔ مرحوم نے یہ تجویز کی ہے کہ کل کتاب کے مصنفین کو حروف تہجی پر مرتب کیا جائے اور ہر مصنف کے نام کے ذیل میں اس کی تصانیف لکھ دی جائیں تاکہ جب کوئی کسی مصنف کا تذکرہ دیکھنا چاہے تو اس کے حالات اور تصانیف ایک جگہ مل جائیں۔ چنانچہ اس کام کے انجام دینے کے لئے ایک شخص کو مامور کیا اور تقریباً دس برس تک پندرہ روپیہ ماہانہ خرچ کرتے رہے لیکن افسوس ہے کہ چونکہ مرحوم میں استقلال نہ تھا اس لئے یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا۔

اسی طرح مرحوم کو گستس فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ عالم موصوف نے ایک جلد میں قرآن مجید کو اصل عربی میں، اور دوسری جلد میں اس کا قیمتی انڈکس یورپ میں شائع کیا جس کے طفیل میں قرآن پاک کی ہر سورت اور آیت آسانی سے نکل آتی ہے اور جو مصنفین و مؤلفین کے لئے نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ لیکن اس میں ہر آیت اور سورۃ کے لئے صرف ہندسوں کا نشان ہے۔ لیکن مرحوم یہ چاہتے تھے کہ بجائے ہندسوں کے سورت کا نام لکھ دیں چنانچہ اس طریقے پر انڈکس مرتب کر لیا گیا تھا اور ارادہ تھا کہ بیروت میں طبع کرا کر کم قیمت پر فروخت کیا جائے، لیکن افسوس کہ طبع کی نوبت نہ آئی۔

مرحوم اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب ایسے لوگوں میں سے کوئی ان سے ملنے جاتا تو اس سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے، خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں اور اگر اس اثنا میں کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب صاحب علم سے

باتیں کررہے تھے کہ اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ وقار الامراء بہادر مرحوم کے فرزند نواب ولی الدین خاں بہادر تشریف لائے ہیں۔ مرحوم نے ملنے سے انکار کردیا اور کہا کہ نواب صاحب سے عرض کرو کہ میں ایک عالم سے گفتگو کررہا ہوں جس کو آپ کی طرف سے ترک نہیں کرسکتا۔ اگر آپ کو مجھ سے ملنا ایسا ضروری ہو تو دو گھنٹے انتظار فرمائیے۔ اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد آپ سے ملوں گا۔

یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاصکر یہ بڑا عیب ہے کہ لوگ اپنے ہمعصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے، وہ نہ صرف اہل علم کی قدر و منزلت کرتے ہیں بلکہ ان کے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا حالیؔ کی ان کے دل میں بہت وقعت تھی۔ چنانچہ جب انہیں معلوم ہوا کہ حیات جاوید چھپ چکی ہے اور مولوی عبداللہ خاں کے پاس کچھ نسخے آئے ہیں تو رات کے آٹھ بجے کتاب منگوائی اور اسی وقت مطالعہ کرنا شروع کیا اور بہت سا حصہ پڑھ ڈالا اور دوسرے دن بغیر ختم کیے نہ چھوڑی۔ ایک روز یہ واقعہ بیان کیا کہ علامہ نولڈکی ہشتاد سالہ سالگرہ پر اس کے شاگردوں اور مداحوں نے اس کی یادگار میں مختلف علمی رسائل لکھ کر ایک کتاب کی صورت میں طبع کرائے جو ایک ایسے فاضل کی یادگار کے لئے نہایت موزوں اور عمدہ یادگار ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ تجویز کی کہ ہم لوگوں کو چاہیئے کہ مولانا حالیؔ کی علمی خدمات کی شکر گذاری کی یادگار میں ایک ایک رسالہ لکھیں اور خود بھی ایک رسالہ لکھنے کا وعدہ کیا۔ اور راقم سے بھی تحریک کی اور اس کتاب کے اخراجات طبع وغیرہ کی خود ذمہ داری لی۔

جس زمانے میں تمدن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے تو اول صبح کو اٹھ کر چند اوراق حیاتِ جاوید کے پڑھ لیتے تھے اور اس کے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے۔

ایک بار حیاتِ جاوید پڑھنے کے بعد فرمایا کہ جو لوگ تذکیر و تانیث اور دلّی لکھنؤ کی زبانوں کے متعلق دُور از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ جب ہماری زبان میں ایسی کتاب موجود ہے جو ہادی و راہبر کا کام دے سکتی ہے تو پھر ان لاطائل بحثوں میں پڑنا محض تضیعِ اوقات ہے۔ زبان، دلّی اور لکھنؤ کی تابع نہیں ہے بلکہ خیالات کی تابع ہے۔ جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں ان کی زبان کبھی فصیح نہیں ہوسکتی۔

مرحوم مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ "تمدن عرب" میں جابجا آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اسی ترجمہ سے لیا ہے۔ ایک روز مولوی عبداللہ خاں صاحب جن سے مرحوم کو بہت

خصوصیت تھی اور ہم کو ان سے مرحوم کے اکثر حالات معلوم ہوئے ہیں آیت استویٰ علی العرش پڑھی اور کہا کہ مولوی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "عرش پر جا براجا" مرحوم پھڑک اٹھے اور کہا کہ استویٰ کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

مرحوم جب نواب سر وقار الامراء بہادر مرحوم کے ساتھ شملے تشریف لے گئے تو مولوی سید احمد مؤلف "فرہنگِ آصفیہ" نے اپنی تالیف "ارمغان دہلی" کے بعض اجزاء پیش کئے۔ مرحوم نے ان کی بہت تعریف کی اور سفارش کر کے پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کرا دیا اور انعام کے لئے خود گذارش لکھ کر سرکار میں پیش کی۔ سرکارِ عالی سے بعد ازاں مؤلف کو گرانقدر انعامات عطا ہوئے۔

مولوی صاحب موصوف پر ایک بار کئی ہزار روپیہ کی ڈگری ہوئی جس سے وہ بہت پریشان تھے۔ انھوں نے مرحوم کو اطلاع دی، مرحوم نے کل رقم ان کے پاس بھجوا دی۔

مرحوم بہت بامروت تھے۔ اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار آتا تو پھر اس شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد براری میں کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ کتابیں جو انھیں بہت عزیز تھیں ان کے دینے میں بھی تامل نہ تھا بشرطیکہ وہ سچا قدردان ہو۔ خاص کر طالب علموں اور اہلِ علم کا بہت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز مولانا شبلی مولوی عزیز مرزا مرحوم مولوی ظفر علی خاں، مرحوم کے یہاں مدعو تھے ۱۲ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے رہے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ مرحوم نے ان کی درخواست پر فوراً کامل مبرد کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعۂ یورپ جس کی قیمت ستر روپئے ہے مولانا کی نذر کیا اور فرمایا مجھ جیسا طالب علم جو خود کتابوں کا شوقین ہے اہلِ علم کی درخواست رد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ ۱۳۰۹ھ میں جب سر سید مرحوم آخر بار حیدر آباد تشریف لائے اور بشیر باغ میں سرکارِ عالی کے مہمان ہو کر فروکش ہوئے تو چونکہ مرحوم کو اپنے کتب خانہ کی نادر کتب کے دکھانے کا شوق تھا، سر سید کو اپنے مکان پر لے گئے اور کتابیں دکھانا شروع کیں، من جملہ دیگر کتب ایک بیش بہا کتاب ایسی تھی کہ اس میں اوّل سے آخر تک اسپین کی اسلامی عمارات کے نقشے اور بہت عمدہ تصویریں تھیں۔ سر سید مرحوم نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ کالج کی لائبریری میں رہے تاکہ مسلمان اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ مرحوم نے کہا

بیشک اسی قابل ہے اور وہ چلتے وقت وہ نسخہ سرسید کی گاڑی میں رکھ دیا۔

مرحوم نے ردالمنطق لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کرواکر مولوی شبلی کی نذر کی تھی۔ انگلستان پہنچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے آپ وہ نسخہ بھجوا دیجئے۔ مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سُست لکھا بلکہ یہ تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لئے آپ طلب کرتے ہیں۔ مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا یہ جواب دیا کہ پانچسو روپیہ کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیں[1]۔ چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکارِ عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصاب تعلیم کے مرتب کرنے کے لئے حیدرآباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے مارے مرحوم سے ملے نہیں لیکن کتب خانہ کے جلسۂ انتظامی میں جب اتفاق سے مڈبھیڑ ہو گئی تو مرحوم اسی خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا۔

جب اہلِ علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو ان کی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ان کا مہمان ہو۔ چنانچہ جب مولانا شبلی حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے۔ مرحوم کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً آ پہنچے اور اپنے گھر لے گئے لیکن جب مولانا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اٹھ گئے تو مرحوم کو بہت رنج ہوا۔ اور یہ رنج ان کے خطوط سے صاف مترشح ہوتا ہے۔

مرحوم اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی رکاوٹ اور مشکل کی پروا نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات حیرت انگیز کام کر جاتے تھے، چنانچہ من جملہ دیگر واقعات کے ہم ایک واقعہ کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔ مرحوم کے والد سید زین الدین خاں صاحب کی عمر کا اکثر حصہ پٹنہ میں صرف ہوا تھا اور مولوی خدا بخش خاں صاحب مرحوم کے والد اور مرحوم سے بہت تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ خدا بخش مرحوم کسی مقدمہ میں وکیل ہو کر حیدرآباد تشریف لائے اور دیرینہ تعلقات کی وجہ سے مرحوم کے مکان پر ہی ٹھہرے۔ انہیں ایام میں ایک بار انھوں نے مرحوم سے یہ خواہش ظاہر کی کہ برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا وکیل ہوں، اگر آپ کی سعی سے سرکار عالی مجھے وکالت درجہ اول کی سند عطا کر دے تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ مرحوم نے نہایت خوشی سے اس میں مقدور بھر کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔

---

[1] مولانا شبلی فرماتے تھے کہ یہ واقعہ بالکل غلط تھا۔ چونکہ میں نے سید علی مرحوم سے سنا تھا۔ اس لئے لکھ دیا۔

دوسرے ہی روز نواب میر افضل حسین صاحب مرحوم میر مجلس عدالت عالیہ (چیف جسٹس ہائی کورٹ) کے یہاں پہنچے اور بہت منت اور لجاجت سے اظہار مطلب کیا اور کہا مولوی صاحب ہمارے والد کے دوست اور ہمارے بزرگ ہیں اگر آپ کی عنایت سے یہ کام نکل جائے تو کوئی بڑی بات نہیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا مگر میر صاحب نے کچھ ایسا غیر متوقع اور دل شکن جواب دیا کہ اس کے بعد مرحوم نے مولوی خدا بخش مرحوم کا ان سے تعارف کرانا بھی پسند نہیں کیا اور بغیر ملائے ساتھ واپس لے گئے۔ جب راستے میں تمام واقعہ مولوی صاحب سے بیان کیا تو مولوی صاحب مرحوم کو بے انتہا رنج و مایوسی ہوئی۔ مرحوم نے کہا آپ دل شکستہ اور مایوس نہ ہوں۔ اگر میر حسین افضل صاحب نے سند نہیں دی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ انشاء اللہ اب ہم کوشش کریں گے کہ آپ خود میر مجلس ہو جائیں اور دوسروں کو سند عطا کریں۔ چنانچہ مرحوم نے جان توڑ کوشش کی اور مولوی خدا بخش خاں کو میر مجلس کرا کے رہے۔

مرحوم کو عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی علمی کام یا تجارت کے لئے روپیہ طلب کرتا تو وہ حتی الامکان بڑی خوشی سے اس کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک صحاف نے ان سے آکر کہا کہ مجھے آپ کوئی کتاب جلد باندھنے کے لئے دے دیجئے۔ مرحوم نے ایک کتاب دی اور کہا کہ اگر تم عمدہ جلد باندھو گے تو ہم تمہیں کام دیں گے۔ جب وہ جلد باندھ کے لے گیا تو مرحوم نے بہت پسند فرمائی اور اس کے کام کی تعریف کی۔ صحاف نے کہا کہ سرکار یہ کیا کام ہے، افسوس سامان نہیں، اگر میرے پاس سامان ہوتا تو پھر آپ میرا کام دیکھتے۔ مرحوم نے فوراً اسے دو ہزار روپیہ کا سامان اور ضروری مشینیں منگوا دیں۔ مطبع شمسی (حیدرآباد) بھی اسی قبیل سے ہے اور مرحوم کے فیض کی یادگار ہے۔ کبھی کبھی وہ طالب علموں کی بھی اسی طرح مدد کرتے رہتے تھے۔

مرحوم اگرچہ شیعہ خاندان سے اور شیعہ والدین کی اولاد تھے اور اسی سے شیعہ بھی سمجھے جاتے تھے، لیکن وہ تعصب سے بالکل بری تھے۔ اور شیعہ سنی کی تفریق کو بہت برا خیال کرتے تھے۔ حالانکہ مرحوم کا کتب خانہ نہایت وسیع تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس میں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب نہیں تھی۔

چنانچہ جب مرحوم کتب خانہ دیکھنے کے لئے رام پور گئے تو نواب صاحب رامپور سے بھی کتب خانے کے متعلق ذکر آیا۔ نواب صاحب نے کسی قدر فخر سے فرمایا کہ "ہم نے وہ کام کیا ہے جو ہمارے اجداد نے نہیں نہیں کیا تھا یعنی اس کتب خانے میں سُنّی کتابیں تو جمع تھیں ہی۔ لیکن ہم نے مذہب شیعہ کی کتب بھی جمع کی ہیں۔

خصوصاً ملا محمد باقر مجلسی کی بحار الانوار کی پچیس جلدیں جو حال ہی میں طہران میں طبع ہوئی ہیں ہم نے منگائی ہیں۔" مرحوم نے فرمایا کہ "شیعوں کی مذہبی کتب محض بے کار ہیں اور ہرگز قابل استدلال نہیں۔ جب بخاری و مسلم جیسی کتابیں جن کے متعلق بے انتہا چھان بین کی گئی ہے اسقام و اغلاط سے بری نہیں ہیں تو ملا باقر کی کتاب کس شمار میں ہے۔" نواب صاحب نے فرمایا کہ "اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ اہل بیت نبوی کے فضائل جو سنیوں نے خصوصاً بخاری و مسلم کے جامعین نے قلم انداز کردیئے ہیں وہ اس میں درج ہیں۔" مرحوم نے کہا "یہ بھی ایک مہمل بات ہے۔ نبی روحانی و اخلاقی اصلاح کے لئے مبعوث ہوا تھا نہ کہ اپنے اہلِ بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کے لئے۔ ایک معمولی تمیز دار شریف آدمی بھی اپنے اہلِ بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کو خلافِ آداب سمجھتا ہے، نبی کا درجہ اس سے بہت ارفع تھا۔ ان سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا خلافِ قیاس ہے۔"

ایک روز مرحوم نے فرمایا کہ کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی جو پڑھا لکھا اور عالم شخص تھا۔ میں نے پوچھا "تم حضرت عمرؓ سے کیوں عداوت رکھتے ہو؟" ایرانی عالم نے جواب دیا کہ "ہم حضرت علیؑ کی پیروی کرتے ہیں۔" اس پر میں نے کہا کہ "حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی جیسا کہ آپ لوگوں کا خیال ہے تو وہ اپنی بیٹی اُمِ کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے نہ کرتے۔" ایرانی نے تعجب سے پوچھا۔ "اس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔" مرحوم نے اپنے کتب خانے سے فوراً تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو کہ شیعہ مذہب کا عالم ہے لاکر دکھائی۔ یہ کتاب یورپ میں طبع ہوئی ہے اور جس کے دیباچہ میں مصنف کے شیعہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے۔ ایرانی اس کتاب اور واقعہ کو دیکھ کر تائب ہوگیا اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی حضرت عمرؓ کو برا نہ کہوں گا اور تعجب ہے کہ ہمارے لوگ ان باتوں کو کیوں چھپاتے ہیں۔

قیام بلدۂ حیدر آباد میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ایک روز راقم، مولوی عبد اللہ خاں صاحب اور ظہیر الدین فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب، مرحوم کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے شیعہ مولوی تشریف لائے۔ مرحوم نے عبد اللہ خاں سے کہا کہ ذرا یعقوبی کی تاریخ جلد دوم تو اندر سے لے آؤ۔ جب وہ کتاب لے کر آئے تو انھوں نے پوچھا کہ آپ اس میں کیا ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں تو مرحوم نے ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر ایک مقام پر سے پڑھ کر سنانی شروع کی، یہ وہی مقام تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا

اس کے بعد شیعہ عالم سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آج کئی روز سے ہم میں اور ہماری بیوی میں بحث ہو رہی ہے۔ وہ میری اس بات کو قبول نہیں کرتیں کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا اور اس قدر مہر ہوا تھا اور ان سے ایک بیٹا مسمیٰ زید پیدا ہوا تھا۔" اس پر حاضرین جلسہ میں سے ایک صاحب نے کہا کہ علمائے شیعہ اس واقعہ سے منکر ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ جبر و اکراہ کا نکاح تھا۔ مرحوم نے نہایت تعجب سے کہا کہ "یہ خیال نہایت جاہلانہ اور ذلیل ہے، دنیا میں کوئی ایسی طاقت تھی کہ وہ فاطمہؓ کی لڑکی کو علیؑ سے چھین سکے یا اس سے زبردستی نکاح کرلے؟ آخر مولوی صاحب خفیف سے ہو کر رہ گئے اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے پوچھا خلفائے اربعہ کے مناقشات اور خانگی جھگڑوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ مرحوم نے فرمایا کہ "خلفائے اربعہ میں کوئی ذاتی دشمنی یا عداوت تو تھی نہیں اگر تھی تو اتنی جتنی ہم میں اور مولوی عزیز مرزا صاحب میں مثلاً اگر کوئی جگہ خالی ہو اور اس کے لئے مولوی عزیز مرزا بھی کوشش کریں اور ہم بھی تو اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ ہم دونوں میں دشمنی یا عناد ہے۔ اگر اس مقام یا موجودہ ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد دوسری جگہ چلے جائیں تو ہم لوگوں میں کوئی دشمنی نہ ہوگی اور اپنے حق کے لئے کوشش کرنا کوئی دشمنی کی بات نہیں ہے۔"

شیعہ سُنّی کے جھگڑے کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ یہ پولٹیکل جھگڑا ہے ان کے پاس ایک عالم جرمن کی کتاب بھی تھی جس میں اس نے اس پر خوب بحث کی ہے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کردیں لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک معزز ممبر نے انھیں لکھا کہ "میرا ارادہ ہے کہ آپ کا نام اب کی سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے تجویز کروں اور مجھے قوی امید ہے کہ سب ممبر اسے خوشی سے قبول کرلیں گے۔ آپ کے انتخاب کے لئے تین بڑے وجوہ ہیں۔ اول آپ شیعہ ہیں۔ دوسرے عالم ہیں۔ تیسرے صاحب مال و جاہ ہیں۔" مرحوم نے جواب میں لکھا "جو وجوہ آپ نے میرے انتخاب کے لئے لکھے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ آپ کا فرمانا ہے کہ میں عالم ہوں، یہ غلط ہے، میری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے دوسرے یہ کہ میں مالدار ہوں، یہ بھی صحیح نہیں، البتہ اتنا ہے کہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں۔ تیسرے یہ کہ میں شیعہ ہوں یہ سچ ہے لیکن میں ۱۱ھ ہجری کا شیعہ ہوں اس سے آگے بڑھنے

کی میں نے ذرا بھی کوشش نہیں کی ہے۔ علاوہ اس کے میں اس قسم کی کانفرنسوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے اور اسی لئے میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پریسیڈنٹ ہونا بھی پسند نہیں کرتا"

ایک روز شمس العلما، مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے کیوں عداوت ہے، حالانکہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے اور بہت سے اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہوتی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر۔ فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتی ہے اگر یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے اگر اسی طرح اگر آپ کی آدھی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا واقعات سے مرحوم کے مذہبی خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ زیادہ تصریح کی حاجت نہیں۔

مرحوم صحیح بخاری کے بڑے مداح اور قدرداں تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ہدایہ کے بھی وہ بہت ثنا خواں تھے اور جس قدر مختلف نسخے ان کے پاس بکنے کو آتے وہ خوشی خوشی انہیں خریدتے تھے حالاں کہ متعدد نسخے موجود تھے۔

اگرچہ مرحوم تعصب سے بری تھے اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیت قومی ان میں ضرور تھی اور اسلام و بانی اسلام پر دل سے یقین کرتے تھے مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ قیام انگلستان میں وہ اکثر ہندوستانی اور دیگر بلاد اسلامیہ کے طلبا اور مقیم اصحاب کی دعوتیں کرتے رہتے تھے ایک بار انھوں نے کنگ ایڈورڈ ہفتم کے باڈی گارڈ کو دعوت دینے کا خیال کیا اور بذریعۂ ٹیلی فون ان سے دریافت کیا۔ ان کے افسر نے نہایت خوشی سے دعوت قبول کی اور کہا کہ یہ تو ہمارے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے کہ عالم سید نے ہماری دعوت کی ہے دعوت کے دو گھنٹے پہلے اس افسر نے ٹیلی فون کے ذریعہ پوچھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مولوی صاحب کو جو ہمارے ساتھ ہیں لیتے آئیں کیونکہ ہم لوگ جاہل ہیں آپ سے کیا باتیں کریں گے۔ مرحوم نے

فرمایا آپ ایک نہیں بلکہ جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے ان مسلمانوں سے تعارف پیدا کرنے کے لئے ترکی اور ایرانی قونصلوں کو بھی دعوت دی اور اس بے تکلفی کی وجہ سے کسی انگریز کو دعوت میں نہ بلایا۔ شام کے وقت جب سب لوگ کھانے کی میز پر آئے تو باڈی گارڈ والوں کے مولوی صاحب نے جو غالباً پنجابی تھے کہا کہ کھانے سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ کے پاس گوشت کہاں سے آیا ہے مرحوم نے پوچھا کہ اس سے آپ کا کیا مقصد ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ لندن میں کہیں حلال گوشت نہیں ملتا۔ سب حرام ہوتا ہے اس لئے میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے ذبح نہ کر لوں گا کبھی گوشت نہ کھاؤں گا۔ مرحوم نے غصے سے تلخ لہجہ میں جواب دیا کہ افسوس آپ جاہل ہیں اور دینِ اسلام سے بالکل بے خبر اور ناواقف ہیں۔ ایک مسلمان کے دسترخوان پر آپ کو اس قسم کے فاسد خیالات و شبہات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیا آپ کو لاتجسسوا کا قول یاد نہیں ہے۔؟ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ حضرت عمرؓ جب غیر قوموں کے ساتھ معاہدہ کرتے تھے تو من جملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ جو مسلمان وہاں وارد ہو، اس کی تین دن تک دعوت کریں کیا ان مسلمان مسافروں کے لئے مسلمان ذبح کرتے تھے یا مسلمان باورچی ہوتے تھے؟ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی شے کے حرام ہونے کا علم نہ ہو اسے حلال سمجھنا چاہیئے۔" چونکہ یہ گفتگو مرحوم نے کسی قدر تلخ اور درشت لہجہ میں کی تھی، اور سوائے ہندوستانیوں کے دوسرے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے تھے اس لئے باقی لوگ مرحوم کا منہ حیرت سے تک رہے تھے۔ آخر ترکی قونصل نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ مرحوم نے سارا قصہ دُہرایا اور کہا کہ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا نمونہ ہے اس سے آپ ان کی اخلاقی حالت کا اندازہ کر لیجئے۔ یہاں یورپینوں نے اوّل ہی سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کوئی پوچھتا ہے "تمہارے مذہب میں پردہ کیوں ہے۔؟" کوئی کہتا ہے "تمہارے پیغمبر نے تعدد زوجات کی اجازت کیوں دی ہے؟" کوئی سوال کرتا ہے۔ "تمہارے نبی نے عورتوں کو مارنے کا کیوں حکم دیا ہے؟ ان اعتراضات اور سوالات کا جواب دیتے دیتے ہم تنگ آ گئے ہیں اور پھر جب یہ مولوی صاحب اور ان کے ہم خیال یہاں کی سوسائٹی میں رہ کر اس قسم کی رکیک باتیں کرتے ہیں تو مسلمانوں کے متعلق غیر قوموں کے خیالات کیا ہوں گے۔ ایسے شخص کے زہریلے خیالات کا اثر تمام قوم اور ملک پر پڑتا ہے۔ ترکی قونصل نے کہا کہ اگر واقعی ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ حالت

ہے تو نہایت قابل افسوس ہے۔ جب اہلِ فوج کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے مولوی صاحب نے سید صاحب کی دل آزاری کی ہے اور انہیں رنج پہنچایا ہے تو ان سب نے مولوی صاحب سے بالاتفاق یہ کہا کہ وہ سید صاحب کے قدموں پر گریں اور معافی مانگیں ورنہ ہم اپنی جماعت سے خارج کر دیں گے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اٹھ کر معافی مانگی اور مرحوم نے خندہ پیشانی سے معاف کر دیا اور جب رخصت ہونے لگے تو مولوی صاحب کو گلے سے لگایا اور الٹی معافی مانگی اور سو روپیہ کا چک ان کی نذر کیا اور یہ نصیحت کی کہ ایسے شخصی اور ذاتی خیالات سے ملک و قوم بدنام ہوتے ہیں آئندہ کبھی کسی سوسائٹی میں ایسی گفتگو نہ فرمایئے گا، ورنہ تمام ہندوستان کے مسلمان غیر قوموں کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے۔

مرحوم ہندوستان کے مرّوجہ پردے کو بہت برا سمجھتے تھے نیز ان لوگوں کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد زوجات کے حامی تھے۔

پارسی قوم کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ قوم پچاس سال میں فنا ہو جائے گی۔ کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔

مرحوم کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں جب کہ وہ "تمدن ہند" کا ترجمہ کر کر رہے تھے انہوں نے اپنے دوست کو وہ باب سنانا شروع کیا جس میں دڑاوڑی قوم (جو ہندوستان کی ایک قدیم وحشی قوم تھی)، ذکر تھا، جب مرحوم پڑھنا ختم کر چکے تو اس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟ اتفاق سے اس وقت ایک مولوی صاحب جو مرحوم سے ملنے کے لئے آئے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارے سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں۔

مولوی محمد سورتی نے جو عربی زبان کے مستند عالم اور قدیم کتب کے شوقین ہیں مرحوم سے ایک کتاب بغرضِ نقل مستعار طلب کی۔ کتاب بھی نادر، مرحوم کو دینے میں تامل تھا مگر مروت کے مارے صاف صاف انکار بھی نہ کر سکتے تھے کتاب نکال کر لائے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بے شک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سُور کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً لاحول ولاقوۃ کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی

ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ مجاوروں نے موٹی اسامی سمجھ کر آگھیرا، مرحوم نے جب یہ دیکھا تو کہا بھئی مجھے کیوں گھیرے ہو میں تو وہابی ہوں، یہ کہنا تھا کہ سب

سب چھوڑ کر الگ ہوگئے۔

مرحوم بہ زمانۂ طالب علمی نیز بعد ازاں پنشن لینے کے بعد انگلستان میں کئی سال مقیم رہے اور انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں جانے اور ملنے کا اتفاق ہوا مگر باوجود اس کے وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے، اور ان کے آداب و تکلفات کو مہمل سمجھتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حب جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے اور اسے صرف روپیہ کمانا اور صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دوسرے کی پروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

زندگی کے آخر زمانے میں مرحوم کو بعض وجوہ سے حیدر آباد دکن کا قیام ترک کرنا پڑا۔ اس وقت انھیں اس کا رنج بہت تھا کیونکہ یہاں ان کے مکانات تھے، کتب خانہ تھا، بیوی بچے سب یہیں تھے اور دو بیٹوں کی ملازمت کا سلسلہ بھی یہیں ہو گیا تھا، دوسرے عمر کا بہترین حصہ یہیں کٹا تھا اور دنیا کے نشیب و فراز اور ادبار و اقبال کے تماشے یہیں دیکھے تھے۔ لہٰذا ان کی محبت وطن کی محبت سے کم نہ تھی۔ لیکن جب یہاں سے جا کر انھوں نے ہردوئی میں قیام کیا (جہاں انھوں نے ایک بڑا مکان اپنے رہنے کے لئے خرید لیا تھا) اور پھر وہاں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں آنے جانے لگے اور قوم کی خدمت میں وقت صرف ہونے لگا تو اس وقت آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ اس سے پہلے عمر عزیز بے کار بکھیڑوں اور تفریح میں گذری، زندگی کا لطف اب آئے گا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یونیورسٹی کا مسئلہ چھڑ گیا جس میں انھوں نے بڑے شوق اور جوش سے کام شروع کیا اور یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب بھی انہیں کو تفویض ہوئی جس کے لئے وہ خاص طور پر موزوں تھے۔ اس میں انھوں نے بڑی محنت کی اور قابل قدر کام کیا۔ آخر وہ وقت جو اگرچہ معین نہیں ہے کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا آ گیا اور بے وقت اجل سر پر آن پہنچی اور دفعتاً ہردوئی میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے بتاریخ ۳ مئی ۱۹۱۱ء انتقال ہو گیا اور قوم کا ایک برگزیدہ فرد اٹھ گیا۔

مرحوم علاوہ عالم اور فاضل ہونے کے متعدد زبانوں کے ماہر تھے اور افسوس کہ اب قوم میں کوئی شخص ان کا جانشین نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم پر حب دولت و جاہ غالب تھی لیکن جب روپیہ ان کے پاس آتا تو اس کے دینے میں بھی وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے۔ اگرچہ اکثر اس سے وہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک اور چلتے پرزے ہوتے یا اشاعت شہرت میں مدد دیتے تھے۔

مرحوم علماء اور طالب علموں کی قدر کرتے تھے اور خواہ ان کی دنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہ ہوں ان سے بڑی مروت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے، ان کی صحبت سے خوش ہوتے تھے اور اس لئے اکثر ان کے علمی تذکرے اور چرچے رہتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی دیکھ کر عربوں کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہند اور غیر ممالک کے سیاح اور علماء کے لئے ان کا عالی شان مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخدلی کے ساتھ حقِ میزبانی ادا کرتے تھے۔ جب جائیے ان کے مکان پر کوئی نہ کوئی ہندی، انگریزی، فرانسیسی، جاپانی امریکن، ترکی یا مصری سیاح عالم نظر آتا تھا۔ دوسروں کی بھلائی اور مقصد براری کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بیکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے۔ نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دستگیری کرنا فرض ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں محکمہ تعمیرات و معدنیات و ریلوے میں سب کے سب یورپین یوریشین اور دیسی عیسائی تھے۔ مسلمان اِکّا دُکّا نظر آتے تھے لیکن جب مرحوم کا تقرر اس عہدے پر ہوا تو مسلمان رفتہ رفتہ داخل ہونے شروع ہوئے اور اب معاملہ برعکس ہے۔

مرحوم کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ جب وہ حیدر آباد سے وظیفہ لے کر انگلستان گئے تو وہ بھی ان کے شریک سفر تھیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی مرحوم آپ کے ہاں مہمان تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ الٹا میں آپ کا احسانمند ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہئیے آپ کو معلوم ہے کہ میری بیوی ہے اور پھر بھی میں اسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بھکانے سے بھٹک جاتے تھے۔ یا حُبِ جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔ خفا ہو جانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہو جاتے تھے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ ان میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔ مرحوم اپنے فضل و کمال سے کام لیتے تو بہت بڑے آدمی ہوتے۔ لیکن افسوس کہ حیدر آباد کی گوناگوں دل فریبیوں اور مجبوریوں نے ان کے وقت عزیز کا بہت سا بیش قیمت حصہ غصب کر لیا اور جاہ طلبی کے بکھیڑوں نے وہ الجھاؤ پیدا کیا کہ اس قدر اطمینان نصیب نہ ہوا کہ وہ علمی مشاغل میں اطمینان کے ساتھ مصروفیت رکھتے جس کے وہ ہر طرح موزوں

اور اہل تھے۔ انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جن کے لئے وہ دن رات سرگرداں و حیران رہا، وہ آرزوئیں جن کی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا اور وہ کوششیں جن کے لئے اس نے اپنی جان تک کھپا دی پانی کے بلبلے سے زیادہ پائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں اور کچھ انہیں کاموں کو بقا حاصل ہے، جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور جو شاید محض ضمنی طور پر کئے گئے تھے۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے، بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ کمال کو بھی پہنچے اور ایسے کام کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلقِ خدا کو ان سے فائدہ پہنچے۔ وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا اور قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو اور جو قدر اور وقعت سے دیکھے جاتے ہوں اور جو لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں۔ مرحوم نے زمانۂ ملازمت اور باقی عمر میں بہت سے کام کئے لیکن اکثر ایسے ہیں جیسے ہوا کا جھونکا آیا اور گیا، لیکن یادگار دنیا میں وہی رہیں گے جن کا اثر دوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا اور یہ ان کی بعض تحریریں ہیں جو ان کے قلم سے نکلیں، ملک میں پھیلیں اور سورج کی روشنی کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک حیات عالم میں اپنا مفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یاد کو ان کے قدردانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

سنہ ۱۹۱۵ء

ایسے وقت میں جب کہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے لئے ہر شعبہ میں انسانوں کی تلاش ہے، جب کہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائب الرائے معتدل مزاج، بے لاگ اور با خلوص کام کرنے والوں کا اُٹھ جانا غضب ہے۔

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چک پر دستخط کر دیتے سے دنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جنھیں اتفاقات زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو محض نام و نمود کے لئے زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔

وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اپنے مطالعہ اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے اور تمام طالب علم (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے۔ یونین کلب میں ان کی تقریروں کی آتش فشانی اور اخوان الصفا میں ان کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی، وہ اس قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور اس لئے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب لوگ قائل تھے۔ خود سید مرحوم انہیں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مگر اختلافات کرنے میں وہ ان سے بھی نہ چوکتے تھے حالانکہ ان کے

سامنے بڑے بڑوں کے پر جلتے تھے۔ علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالبًا ان کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا ان تھک ہو۔ وہ پہلے درجہ کے ذہین اور ذکی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی معاملات میں گفتگو کرتے اور پولیٹکس اور خصوصًا انگلستان کے سیاسیات سے انھیں ابتدا سے بے انتہا دلچسپی تھی اور جس قدر انہیں اس سے واقفیت تھی، ہماری قوم میں شاید ہی کوئی اس قدر واقف ہو۔ وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے، لیکن مادرِ کالج کا برتاؤ اُن کے ساتھ ہمیشہ ظالمانہ رہا۔ کئی بار ان کا نام پیش ہوا مگر وہ کبھی کالج کے ٹرسٹی منتخب نہ ہوئے اور حیرت و افسوس یہ ہے کہ ان کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کی ترجیح دی گئی جن کا نام لکھنا بھی ہم اس صفحۂ کاغذ پر گوارا نہیں کر سکتے۔ کالج کے کارنامے پر یہ بڑا دھبہ رہے گا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ کبھی نچلے نہ بیٹھے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ علاوہ بے شمار مضامین کے کئی رسالے ان کی یادگار ہیں۔ ملک و قوم کی خدمت ان کا نصب العین تھا اور اسی چونپ نے ان سے ریاست حیدر آباد دکن کی ایک معزز خدمت کو چھڑا کر میدانِ وکالت میں لا کھڑا کیا۔ یہاں اُن کی طبیعت کے اصل جوہر کھلے۔ وکالت کا پیشہ ایسا ظالم پیشہ ہے کہ وہ انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتا لیکن باوجود اس پیشے کی مصروفیتوں کے ہمیشہ قومی کاموں میں پیش پیش رہے۔

کوئی پندرہ سال ہوتے ہیں کہ خواجہ صاحب کی ہی تحریک سے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے چند صیغے الگ قائم ہوئے۔ اصلاحِ تمدن کا صیغہ ان کے سپرد ہوا۔ انھوں نے اس فرض کو جس مستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وہ مخفی نہیں ہے۔ کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور ان کے بعض سکریٹری بھی ان سے زیادہ نامور لوگ تھے لیکن جیسا اصلاح تمدن کا صیغہ چمکا وہ بات کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے پرچے عصر جدید کے ذریعہ سے اصلاحِ تمدن پر بڑے بڑے پُر زور مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لکچر دیئے اور تقریریں کیں اور مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرت کی ایک ہلچل پیدا کر دی لیکن افسوس کچھ تو ان کے تلون کی وجہ سے اور زیادہ تر کانفرنس کی بے اعتنائی اور مالی دقتوں کی وجہ سے انھیں اس صیغہ کو خیرباد کہنا پڑا، اور اس کے بعد سے آج تک کسی کی ہمت

لہ ممبر کونسل ہونے کے بعد خواجہ صاحب ٹرسٹی بھی بنا لئے گئے تھے۔

نہیں ہوئی کہ وہ اس امانت کا بار اٹھائے اور اگرچہ صیغہ مرگیا لیکن اس کا اثر اور اس کی یاد اب تک باقی ہے۔

خواجہ صاحب طبعًا ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ اس پر بعض اوقات ناکامیابی کا بہت بڑا اثر پڑتا تھا۔ اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی صحت خراب رہتی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک ناکامیابی کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ اور جلد پریشان ہوجاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جس کام کو لیتے تھے اس میں ہمہ تن منہمک ہوجاتے تھے اور چاہتے تھے جو جوش اور آگ ان میں بھری ہے وہی دوسروں میں بھی ہو۔ لیکن یہ کہاں ہوتا ہے، خصوصًا ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتھروں سے سر پھوڑنا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مایوسی ہوتی ہے اور یہ مایوسی انھیں پریشان کردیتی تھی۔ چنانچہ انھیں ناکامیوں اور ناکامیابیوں نے انھیں ایک بار ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ وہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرتے ہوئے ایران پہنچے وہاں بھی وہ خاموش نہ رہے اور انھوں نے ملکی اصلاح کا ڈول ڈالا۔ وہاں کے مشہور لوگوں سے ملے، تقریریں کیں، اصلاحِ ملک پر بحثیں کیں، لیکن اس وقت ایران کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی۔ لہٰذا انھیں مجبورًا لوٹنا پڑا اور اگرچہ وہ مایوس ہوگئے تھے مگر وہ زیادہ مضبوط ہوکر آئے تھے اور کچھ ہی عرصے بعد انھوں نے دُگنی اور چوگنی قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔

ایران جانے سے قبل صوبہ متحدہ کی کونسل ممبری کے لئے بڑے شد و مد کے ساتھ کوشش کی تھی، لیکن اسی سختی کے ساتھ انہیں ناکامیابی بھی ہوئی۔ اس کا ان پر بڑا اثر ہوا اور من جملہ دیگر وجوہ کے ایک یہ وجہ بھی ہندوستان سے کچھ دنوں کے لئے ہجرت کرنے کی ہوئی۔ لیکن جب دوبارہ ان کا انتخاب ہوا تو انھوں نے اس قدر شوق، مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ اس اہم کام کو انجام دیا اور اس نیابت کا حق اس خوبی سے ادا کیا کہ اس سے ثابت ہوگیا کہ صوبہ متحدہ کے مسلمانوں میں اگر کوئی کونسل کی ممبری کا حق رکھتا ہے، وہ خواجہ صاحب ہی تھے۔ غالبًا اس وقت ان کے مخالفوں کو کچھ کم ندامت نہ ہوئی ہوگی۔ اس زمانہ کا ان کا بڑا کارنامہ مسئلہ سود ہے۔ اس مسئلہ پر انھوں نے اس قدر جان توڑ محنت کی تھی کہ ان کی صحت کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اگرچہ اس میں پوری کامیابی نہ ہوئی لیکن ایک روز یہ مسئلہ پاس ہوکے رہے گا اور اس کامیابی کا سہرا خواجہ صاحب مرحوم کے ہی سر ہوگا۔

اگرچہ خواجہ صاحب عقائد کی رو سے پکے شیعہ تھے، لیکن ان میں تعصب نہ تھا۔ وہ مسلمانوں کی خدمت

ہیں شیعہ سنی کی مطلق تمیز نہ کرتے تھے اور سب کی خدمت کے لئے یکساں حاضر تھے اور یہی وجہ تھی کہ اگرچہ وہ شیعہ کانفرنس کے بنا وقیام میں شریک غالب تھے، مگر تھوڑے عرصہ بعد انہیں اس سے کنارہ کشی کرنی پڑی۔

آخر آخر میں ان کی طبیعت میں ایک خاص اعتدال پیدا ہو گیا تھا اور ان میں وہ اضطراب اور پریشانی اور ضد نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ یہ اعتدال کچھ تو دنیا کے نشیب و فراز اور تجربوں نے پیدا کر دیا تھا اور کچھ کونسل کی ممبری نے۔ مگر پھر بھی وہ شمالی ہند کی زہریلی آب و ہوا سے نہ بچ سکے، ان کی ساری خدمت اور کوشش مسلمانوں کی قوم کے لئے تھی اور وہ بھی شاید شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے لیکن تاہم ان کی نظر وسیع تھی اور ان تنگ دل مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرح نہیں تھے جن کے کاموں کی بنیاد نفسانیت پر ہوتی ہے اور جنھیں بلا لحاظ دوسرے کے ضرر کے اپنی ہی کامیابی کی دھن ہوتی ہے یا جو دوسرے کے ضرر پر اپنی کامیابی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اس سے بری تھے۔ شاید زمانہ انہیں گروہ بندیوں اور جتھوں کا ہے، شاید یہ پہلی منزل ہے۔ اور آج کی محدود کوششیں کل ہمیں اس مقام پر پہنچا دیں جہاں جتھوں اور گروہوں کی ناہمواریاں مٹ کر مساوات پیدا کر دیں گی۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

خواجہ صاحب کا ذوق علمی تھا۔ ان کا مطالعہ طالب علمی سے لے کر آخر تک جاری رہا، لیکن چونکہ پہلی سی فرصت نہ تھی، اس لئے مطالعہ کی بھی وہ شان باقی نہ رہی مگر وہ ہمیشہ علمی مباحثوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے، قلم ان کا آخر دم تک نہ رکا اور وہ برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، عصر جدید کو دوبارہ زندہ کیا۔ مگر افسوس کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ان کی رایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ ایسے شخص کے دماغ کا نتیجہ ہیں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ آخر زمانہ میں ان پر مذہب کا رنگ بہت غالب آ گیا تھا، شاید اس کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ ان کے مطالعہ نے زمانے کا ساتھ نہ دیا ہو، یا صحت کی خرابی کچھ مساعد ہوئی ہو یا یہ کہ مذہب کے غوامض اور اسرار کی طرف انہوں نے خاص توجہ کی ہو۔ خیر کوئی وجہ ہو، ان پر مذہب کا رنگ گہرا چڑھ گیا تھا اور ان کے آخر زمانے کی تقریروں اور تحریروں کے فقرے فقرے سے مذہب کی بُو آتی ہے۔

مرحوم کی زندگی پاک اور اس کا دامن بے داغ تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے آخر

دم تک کام کرتا رہا۔ اس نے خلوص اور جوش کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت کی۔ صداقت اور جوش کے ساتھ اعتدال مزاج نے اسے اصلاح کا زیادہ اہل بنا دیا تھا، اور اب اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہو گئیں تھیں۔ لیکن ایسے وقت میں جب کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اس نے ہم سب کو داغِ مفارقت دیا۔ اسے بے وقت موت آئی۔ یہ اس کے کام کا زمانہ تھا۔ قوم کو ابھی اس سے کچھ کام لینا تھا لیکن اجل کے زبردست ہاتھ نے ساری امیدیں خاک میں ملا دیں۔

بہرحال مرحوم کی زندگی عبرت آموز ہے اور جو لوگ قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں انھیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

یہاں یہ بات بھی کچھ کم فکر و تشویش کی نہیں کہ ان لوگوں میں سے جو خاص اس عصر جدید کا نتیجہ ہیں۔ جس جس نے قوم کی خدمت کی وہ جوان ہی چل بسا۔ مسٹر لانگ، مسٹر گھوکھلے، ڈاکٹر ستیش چندر پنڈت بشن نرائن در، خواجہ غلام الثقلین اور دوسرے بیسیوں نوجوان شباب میں نذرِ اجل ہو گئے۔ کیا یہ مسئلہ قابلِ غور نہیں ہے؟

حکیم امتیاز الدین

۱۹۲۷ء

عزیزی[1] ہمارا بے مثل دوست 'حکیم' مرگیا۔ افسوس صد افسوس! وہ اپنے فن اور رنگ میں ایک تھا۔ اگرچہ طبیعت کا کمزور اور لاُابالی تھا مگر دوستی کا سچا اور دُھن کا پکا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے کام کا نہ تھا۔ مگر خیال میں اس نے ایک ایسا عالم بنا رکھا تھا کہ عالمِ مثال بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس میں ہر بات انتہائی تھی۔ محبت تھی تو انتہا درجے کی۔ میانہ روی سے وہ بالکل آشنا نہ تھا۔ قدامت اور جدت عجب طرح سے اس کے مزاج میں سموئی تھی۔ قدامت ایسی، کہ اچھے اچھے پرانے لوگ اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے اور جدت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اس کے آگے ماند تھے۔

وہ اپنے خیال میں آزاد مطلق العنان، اور اپنی طبیعت کا بادشاہ تھا۔ وہ بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اس کی ساری کائنات عالمِ خیال میں تھی جو کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوئی۔ اس کا تخیل اس قدر بلند تھا کہ فہم وہاں پہنچتے پہنچتے لڑکھڑانے لگتا۔ شعر کا ذوق ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کا تھا کہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ اگرچہ وہ شاعر نہ تھا لیکن اچھے اچھے اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے، اس کا ہر فعل اور اس کی ہر بات شعر تھی۔ ایک معمولی مصرع، قوال کا ایک بول آپے سے باہر کر دیتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ آپے سے باہر رہتا تھا۔

---

[1] مولوی سید ہاشمی فرید آبادی۔

جس قدر جلد وہ بگڑ جاتا تھا اسی قدر جلد وہ خوش بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی باتیں، اس کی چال ڈھال اس کی ہیئت اس کی طرزِ معاشرت، اس کا برتاؤ سب نرالے تھے اور سب میں لاأبالی پن پایا جاتا تھا۔ وہ سوائے اپنے خیال کے کسی چیز کا پابند تھا، مگر پہلے درجہ کا خوددار بھی تھا۔ وہ اپنے فن میں باکمال تھا۔ اس کی حذاقت مسلم تھی۔ وہ طبیب ہی نہ تھا حکیم بھی تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ وقت پر وہ کام کر جاتا تھا جو بڑے بڑے حاذق طبیب اور ڈاکٹر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ غریبوں کا غم خوار اور دوستوں کا ہمدرد تھا۔ افسوس کہ حیدرآباد ایک ایسی ذات سے خالی ہو گیا جس کی نظیر اب نہیں ہے۔ لوگ اسے بہت یاد کریں گے، احباب کے جلسے اس کے بغیر سونے ہوں گے، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھا اور سب سے زیادہ اس کے غریب دوست اس کا ماتم کریں گے۔

مولانا وحید الدین "سلیم" مرحوم

۱۹۲۹ء

مولانا سلیمؔ کے انتقال سے اردو ادب کی صف میں ایک جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں ہے۔ جامعۂ عثمانیہ ہی کو ان کا جانشیں ملنا مشکل نہیں بلکہ اب ان جیسا ادیب سارے ملک میں نظر نہیں آتا۔ وہ ایک جامع حیثیات شخص تھے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ اردو زبان پر انکی وسیع نظر تھی، خاص کر نئے الفاظ بنانے میں انھیں بڑا ملکہ تھا۔ ان کی کتاب "وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ" ایک حد تک ان کی وسعتِ نظری اور تبحّر کی شاہد ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ شاعری ان کے زورِ طبیعت کا نتیجہ تھی، بعینہٖ جیسی مولوی نذیر احمد مرحوم کی شاعری، لیکن "سلیم" مرحوم ان سے سبقت لے گئے تھے۔ ان کے قلم اور آواز میں بڑا زور تھا۔ ان کے چہرے سے ان کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی، یہ سب باتیں مولوی نذیر احمد سے ملتی جلتی تھیں۔

مرحوم نے عمر بھر یا تو طالب علمی کی یا علم و ادب کی خدمت کی۔ علاوہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے وہ اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس بھی تھے۔ "مسلم گزٹ" کے پرچے جن صاحبوں نے غور سے پڑھے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ایسے زبردست مضامین معاملات وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کو جب انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اس کی کایا پلٹ دی، یا تو وہ ایک مردہ اخبار تھا یا دفعتاً زندہ ہوگیا۔ ان کا رسالہ "معارف" اردو کے ان چند رسالوں میں تھا جنھوں نے ملک میں علمی ذوق پیدا کر کے زبان کی حقیقی خدمت کی ہے۔ وہ کسی رنگ میں ہوں، تھے

وہ ادیب ہی، سیاسیات کا انہیں کوئی ذوق نہ تھا، البتہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔

مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے، مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے، مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا، جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل وقوع بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے، ان کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاسیات کا ذوق نہ تھا اسی طرح باوجود زبردست عالم و فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے، یہ ذوقی چیز ہے اسے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔

جس طرح انھیں طالب علمی میں مولانا فیض الحسن جیسے بے مثل، ادیب استاد ملے اسی طرح اس کے بعد سر سید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے ان بزرگوں نے ان کے خیالات اور ادب پر بہت اثر ڈالا۔ مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے، مصلحتِ وقت اور زمانہ شناسی ان کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بد نصیبی سے انھوں نے اس کوچہ میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لئے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیئے اور کچھ صحبت اور تجربہ۔ ان میں سے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

ان کے دوست بہت ہی کم تھے۔ شاید دو چار ہی ہوں گے مگر جن کے دوست تھے، دل سے تھے لیکن ساتھ ہی بہت مرنج و مرنجان تھے۔ کسی کو حتی المقدور ناراض نہیں ہونے دیتے تھے۔ خود خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے۔ بہت بے تکلف تھے اور خوب باتیں کرتے تھے اور خوب ہنستے اور ہنساتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے وہاں اُردو کا پروفیسر بھی ایسا ہونا چاہیئے تھا جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو۔ انہوں نے اس جامعہ کے طلبا میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا ہے وہ انہی کا کام تھا اور یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے۔

مرحوم کی طالب علمی کا زمانہ بہت عسرت میں گزرا اور آخری زمانہ جو فارغ البالی کا تھا وہ بھی افسوس ہے کہ عسرت ہی میں بسر ہوا۔ انھیں اپنی فارغ البالی سے کچھ لینا نہ تھا۔ گو ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، شاید اڑسٹھ کے لگ بھگ، لیکن ان کے قویٰ ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں اور جی سکتے تھے لیکن انھوں نے کبھی صحت وصفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام کیا۔ وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے۔ یہی ان کی بیماری اور بالآخر ان کی موت کا باعث ہوا۔

انجمن ترقی اردو اور خاصکر رسالہ "اردو" سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ان کے بعض بہترین مضامین "اردو" میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا شرر مرحوم کے انتقال پر جب انجمن نے مرحوم کے نام سے "اردو" کے بہترین مضامین کے لئے مستقل طور پر سالانہ تین انعامات کی تجویز کی تو سب سے پہلا انعام جو دوسو روپیہ کا تھا مولانا نے خود ہر سال دینا منظور فرمایا وہ صرف ایک سال دینے پائے تھے کہ دوسرے سال خود اس دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ میرے مہربان اور شفیق دوست تھے اور مجھے ان کی موت کا بے حد رنج ہے۔ میں ان کی موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ ان کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر علمی اور ادبی کام میں ہم ان کا نام سب سے پہلے شریک کرتے تھے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہو گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، ان کی تحریر میں بڑی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا بات کی تہہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو استاد تھے۔ جدید تعلیم نہیں پائی تھی، مگر مغربی تعلیم کا جو منشا ہے اس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے، مگر جب انگریزی سے اردو میں اصطلاحات یا ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی داں بھی ان کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے، وہ الفاظ کے کینڈوں اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے۔ اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آرہے ہیں۔

ہمیں ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم وادب کی خدمت میں وقف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم بننا

بہت دشوار ہے۔ انھوں نے محض اپنی محنت اور قابلیت سے یہ درجہ پایا۔ ایک غریب لڑکا جس کے پاس پڑھنے کو کتابیں اور بھر پیٹ کھانے کو روٹی نہ تھی، وہ اپنی ہمت اور شوق اور اپنے علم وفضل کے زور سے ایسا ہوا کہ آج اس کی موت پر ایک حقیقی طبقے کو رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم وادب کا ایک ستون گر گیا۔ ان کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے۔

گدڑی کا لال۔۔۔نورخاں

سنہ ۱۹۳۰ء

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ ناموراور مشہور لوگوں کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں، اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولتمندوں، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

نورخاں مرحوم کنٹنجنٹ کے اول رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدرآباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہو سکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی، بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے تب کہیں جاکر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ کنٹنجنٹ والے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے لیکن بعد میں یہ قید اٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہیں رہا پہلے زمانہ میں سپاہ گری بہت معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا اب اس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے ہر کوئی اس کی قدر نہیں کر سکتا۔ اس لئے شریف روتا اور ذلیل

ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ کرنل نواب افسر الملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں، کنٹنجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسط سے نواب، کرنیل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدیدار ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے ؟

اول رسالے کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ خانصاحب مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض شناسی میں مشہور تھے، یہ ڈرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہو کر آتے تھے، ڈرل سکھاتے تھے۔ اس لیے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔ وہ بڑے شہسوار تھے اور گھوڑے خوب پہچانتے تھے، بڑے بڑے سرکش گھوڑے جاپٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے انہوں نے درست کئے گھوڑے کو سدھانے اور پھیرنے میں انہیں کمال تھا۔ چونکہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے۔ گھوڑدوڑ میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔ ان کے افسر اُن کی مستعدی اور خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے۔ لیکن کھرے پن سے وہ بعض اوقات ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے ان سے کسی بات پر خفا ہو کر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے انھیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی۔ خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے انھوں نے فوراً رپورٹ کر دی لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آگے نہ بڑھے۔ مگر خاں صاحب نے ایک نہ سنی، معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا۔ کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خاں صاحب سے معافی مانگے، ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی ایسی خود داری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے

اچھے بُرے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ شریف افسر خاں صاحب کی سچائی اور دیانت داری اور جفاکشی کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے کہ جن کے سر میں خناس سمایا ہوا تھا انہیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور وہ ہمیشہ ان کے نقصان کے درپے رہتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خودداری کو جوہر شرافت سمجھتے تھے۔ لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں تاہم ان کے اکثر انگریز افسران ان پر بہت مہربان تھے خاصکر کرنل فرن ٹین ان پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو۔ جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفیٰ دیا تو اپنا تمام مال و اسباب اور سامان

جو ہزار ہا روپے کا تھا خاں صاحب کے سپرد کر گئے۔ یہ امر انگریز افسروں کو بہت ناگوار رہا۔ اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اس نے کرنل موصوف کو لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کر گئے۔ اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔ اگر اب بھی لکھیں تو اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نور خاں پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے۔ ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی۔ چلتے وقت واپس کرنی بھول گئے۔ اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔

خاں صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا۔ آپ کرنل صاحب کو لکھیے وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہو گا۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خاں صاحب نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور میں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔ غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہو کر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرر سے اس سامان کی ایک مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خود خریدی اور کچھ نیلام کے ذریعہ بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا دوسرا کوئی افسر، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانسو روپے نقد بطور شکرانے کے خاں صاحب کو دیے۔ خاں صاحب نے لینے سے انکار کیا اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انہوں نے سوائے بندوق کے دوسری کوئی چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر تھے، ان پر بہت مہربان تھے، رسالے کے شریف انگریزوں سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو نقصان بہت پہنچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے خوشامد سے انہیں چڑ تھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انہوں نے کہا میں سائیس نہیں ہوں۔ اس نے ایسا جواب کا ہے کو

سنا تھا بہت چپ چپ نہیں ہوا مگر کیا کرتا۔ آخر باگ درخت کی ایک شاخ سے اٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق کہ باگ شاخ سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد، بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں سمجھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں، وہ بیمار بن گئے اور اسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض اوقات اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ وہ مسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انہیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں مگر خاں صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہ اب میں اپنے وطن دولت آباد میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرما دیں تو بہت اچھا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمہیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائے گی انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے۔ آخر مجبور ہو کر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار صاحب کی عنایت سے وہ قلعۂ دولت آباد کی جمعیت کے جمعدار ہو گئے اور بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی، کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھ کر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور انداز سے دی کہ ایک سکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا کہ میاں اب تمہاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں سستانے کے لئے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب

سے سگرٹ دان نکال کر سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلامی کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگرٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگرٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدیداران کا رنگ فق ہوگیا۔ مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ لہو کے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت لے دے کی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی اس پر چون وچرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہیے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعۂ دولت آباد بھی آگیا۔ اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آگئے دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی۔ اس میں باغ لگانا شروع کر دیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں آپہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے۔ مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے کہنے لگے آپ کی جان ومال کو دعا دیتا ہوں آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آگئی ہے۔ مسٹر واکر نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا کام ہے، دیکھو تمہارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہیں، ایک ایک آنے کو انجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہو جائے گی۔ خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کمبخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے، تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لئے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑ گل جاتے ہیں، کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرندے کھا جاتے ہیں۔ اور پھر ہماری دن رات کی محنت۔ مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اور چند باتوں میں آدمی ایسا پرکھ لیتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں ویسا ہی نکلتا ہے۔ کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب ایسے قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ فوراً ہی خاں صاحب کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔ نواب برزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے، مقبرہ کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفارش کر کے

باغ سے پانچ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کرا دیا۔

نواب برزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ وہ اسے بیچنا چاہتے تھے کلب میں کہیں اس کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے میں اسے خرید لوں گا۔ مگر پہلے نور خاں کو دکھالوں، وہاں سے آکر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھئی اس گھوڑے کو دیکھ آؤ کوئی عیب تو نہیں، خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا میرا نام لے دیا۔ گھوڑے میں کوئی عیب ہوا تو میں چھپاؤ نگا نہیں اور صوبیدار صاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو، کل جا کے ضرور گھوڑا دیکھ لو۔ خاں صاحب گئے۔ گھوڑا نسل کا تو اچھا تھا مگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔ انہوں نے صاف صاف آکے کہہ دیا اور ڈاکٹر صاحب نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ صوبے دار آگ بگولا ہو گئے دوسرے روز مقبرے میں آئے اور باغ کا رجسٹر منگوایا اور نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر حرفوں اور لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا مگر انہوں نے اس کی تلافی کر دی، یہ سُن کر صوبے دار صاحب اور بھی جھنجھلا گئے۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدرآباد چلے گئے۔ ان کی خدمت کا دوسرا انتظام ہو گیا کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب ناظم تعلیمات ہو گئے اور میں ان کی عنایت سے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر اورنگ آباد آیا ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نور خاں سے ملایا اور ان کی سفارش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرس کر دیا تھا، میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرر کر دیا۔ وہ مدرسی اور محرری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرسوں اور محرروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الاؤنس بھی جاری ہو گیا۔

اعلیٰ حضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب وہوا کو بہت پسند فرمایا اور ایک عظیم الشان باغ لگانے کا حکم دیا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اور ان سے بہتر یہ کام کوئی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو ان کی طبیعت کے مناسب تھی اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے اور جب تک دم میں دم رہا اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانتداری سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے

لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی بات کی اور معاملے کی، ان کی سرشت میں تھی خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے اسی میں انھیں نقصان بھی اٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے دن ہو، رات ہو، ہر وقت کام کرنے کو تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہئے تو ایسی خوشی سے کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکّے اور بڑے وضعدار تھے، چونکہ ادنیٰ اعلیٰ سب ان کی عزت کرتے تھے اس لئے ان کے غریب دوستوں سے بہت سے کام نکلتے تھے۔ ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف ان کے گھر پہنچ جاتے اور وہ ان سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آکر ٹھہر جاتے تھے ان کی دعوت بھی کر دیتے تھے، بعض اوقات ٹوپیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتًا مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خوددار ایسے کہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انہیں خاص انس تھا، میں کوئی چیز دیتا تھا تو کبھی انکار نہ کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے، مٹھاس کے بے حد شائق تھے۔ ان کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں۔ انہیں مٹھاس کو کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اکثر جیب میں گڑ رکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے قسم قسم کے تکلف کے کھانے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے یہ خیال کر کے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا کہنے لگے کہ "حضرت یہ میٹھا ہے۔" مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے، جب وہ ختم ہو گیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ ان حضرت نے پھر ٹوکا کہ حضرت یہ میٹھا ہے، انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا۔ جب کبھی وہ کسی دوست کے ہاں جاتے وہ انھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خاں صاحب بہت زندہ دل تھے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی، وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب جب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اترتے ہی اپنا روپیہ پیسہ سب ان کے حوالے کر دیتے تھے اور سب خرچ ان ہی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جانے سے ایک روز قبل وہ حساب لے کر بیٹھتے، بعض وقت بب بدھ نہ ملتی تو آدھی آدھی رات تک لئے بیٹھے رہتے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب کہتے کہ خانصاحب یہ تم کیا کرتے ہو، جو خرچ ہوا ہوا باقی جو بچا وہ دے دو یا زیادہ خرچ ہوا ہو تو لے لو مگر وہ کہاں مانتے تھے، جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا انہیں اطمینان نہ ہوتا۔ چلتے وقت کہتے کہ لیجیے صاحب یہ آپ کا حساب ہے اتنا خرچ ہوا اور اتنا بچا۔ یا کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے کہ اتنے پیسے ہمارے خرچ ہوئے یہ ہمیں دلوائیے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انھیں کچھ شبہ ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب لے کر بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آنے آپ کے رہ گئے تھے، وہ بھیجے جاتے ہیں، یا اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے، وہ بھیج دیجئے گا، ڈاکٹر صاحب ان باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے، اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضعدار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!

محسن الملک

۱۹۳۴ء

قدرت نے نواب محسن الملک مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں، وجاہت، ذہانت خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کرلیتا تھا۔ خطاب یا نام اٹکل سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ مسمیٰ کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا، نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں۔ عطائے خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن محسن الملک کا خطاب ان کے لیے بہت ہی موزوں نکلا۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو ان سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں۔ اگر کسی نے سلام بھی کرلیا تو اُن پر اس کا بار رہتا تھا۔ اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کرلیتے انہیں چین نہ آتا، یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہیں بھولتے تھے۔ اور یہ میں ذاتی علم سے کہتا ہوں کہ وہ بھی ان کے زیر بار منت تھے۔ سیاسی مصلحتیں بعض اوقات اہلِ حکومت کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان افراد کو جو اُن کی یا حکومت کی راہ میں حائل ہیں دودھ میں مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں۔ مرحوم کو بھی کبھی ایسا کرنا پڑتا، لیکن انھوں نے اس ناگوار اور دل شکن کام کو اس خوبی اور سلیقے سے کیا کہ مخالف ہونے پر بھی محسن الملک کو دعائیں دیتے گئے اور جب تک زندہ رہے ان کے شکر گزار رہے۔

وہ جوہر قابل تھے مگر موقع کی تاک میں تھے۔ حیدرآباد میں ان کی سیاست ذاتی تدبر، انتظامی قابلیت کے جوہر کھلے۔ ریاستوں میں نوکری کرنا اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، وہاں سازشوں، ترغیبوں اور پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تیز نظر اور ہوشمند بھی

پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ پھنسنا ہی پڑتا ہے البتہ فرق اتنا ہے کہ اکثر تو ذاتی اغراض کے لیے یہ سب جتن کرتے ہیں، مگر خاص خاص لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ریاست کی بہبودی کی خاطر اپنا سر اوکھلی میں دے دیتے ہیں، ان چند مخصوص لوگوں میں نواب محسن الملک کا بھی شمار ہے۔ اس اکھاڑہ میں اترنا اور بلوہ نکل آنا اصل حکمت اور تدبر ہے اور یہ کوئی محسن الملک سے سیکھتا۔ انہیں ان جھگڑوں میں پھنسنا پڑا، بعض اوقات طوعاً اور بعض اوقاتاً کرہاً، لیکن انھوں نے کبھی ریاست کے مفادات کو ذاتی اغراض پر قربان نہیں کیا۔ وہ کوئلوں کی اس کوٹھری میں گئے مگر ہمیشہ بے داغ نکل آئے لیکن باوجود اس قدر مدبر ہوشمند اور شاطر ہونے کے آخر وہ خود بھی اسی کا شکار ہوئے۔

ریاستوں میں دو گونہ مصیبت ہوتی ہے۔ ایک اندرونی اور دوسری بیرونی۔ پچاس برس پہلے کا ذکر ہے اب رنگ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ خود مختار حکومتوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ انھیں سازشوں کی بہت گنجائش ہوتی ہے ہر شخص کی (خواہ وہ کوئی ہو) یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سرکار کو خوش کر لیا جائے جس سے پیا خوش اسی کا راج۔ اسی سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس کشمکش سے کذب وافترا، بہتان، مخبری، غرض کوئی ایسی حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے خلاف کام میں نہ لاتے ہوں۔ یہ ایک عجیب اسرار ہے جس کا سلسلہ شاخ در شاخ دور دور پہنچتا ہے اور عجیب رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور ایسے حیرت انگیز نتائج پیدا ہوتے ہیں جن کا سان گمان بھی نہیں یہ بڑی طویل داستان ہے، اس کی تفصیل کو دفتر درکار ہیں۔ اس کے لئے بعض لوگوں کے دماغ خاص طور پر موزوں ہوتے ہیں۔ یہاں علمی قابلیت اور فضیلت کام نہیں آتی، یہ کوچہ ہی دوسرا ہے۔ بعض لوگ دیکھنے میں بالکل بدھو معلوم ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ایسے ہی ہیں لیکن بلا کے سازشی ہوتے ہیں اور ان کا دماغ ان معاملات میں ایسا رسا ہوتا ہے کہ ان کے کارنامے دیکھ کر بڑے بڑے مدبر اور قابل لوگ ششدر رہ جاتے ہیں۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یہ چیزیں خوب پھلتی پھولتی تھیں۔

یہ تو ہوئی ایک مصیبت اور اندرونی۔ اب دوسری مصیبت کا حال سنیے جو بیرونی ہے۔

والئ ریاست اپنے علاقہ کا حاکم با اختیار ہے۔ سیاہ وسفید کا مالک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک ایسی پچر لگی ہوئی ہے جس کے سامنے سارے اختیارات دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب وغریب شخص ہوتا ہے، نہ صاحب اختیار ہے نہ صاحب جاہ ومنصب، نہ غیر معمولی قابلیت وذہانت رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے، یہ ریذیڈنٹ بہادر ہیں راج پاٹ تو "حضور" کا ہے لیکن اس "کنکوے" کی ڈور "صاحب عالی شان بہادر" کے ہاتھوں میں ہوتی ہے یہاں بڑے بڑے مدعیوں کے دعوے باطل ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے مدبروں کی تدبیریں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ "بڑے صاحب" کی نظر پڑی تو ایک دنیا پھر جاتی ہے۔ بعض اوقات "رزیڈنسی" اور "پیلس" دو بڑی رقابت گاہیں ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک طرف فارن آفس اور گورنمنٹ اور دوسری طرف ارکان ریاست اور مصاحبین حضور ایک دوسرے سے الجھ جاتے ہیں حسد اور "رقابت" "پرسٹیج" اور بات کی پیچ بیچ میں آپڑتی ہے جس کی وجہ سے سازشوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اور ایسے پیچ پہ پیچ پڑنے شروع ہوتے ہیں کہ اصل معاملہ تو الگ رہ جاتا ہے اور بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات حالت ایسی نازک ہو جاتی ہے کہ حکومت تو رہی ایک طرف، جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اس پُرپیچ گتھی کو اس طرح سلجھانا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے، رزیڈنٹ بہادر بھی خوش رہیں اور ریاست کے وقار کو بھی زیادہ صدمہ نہ پہنچے اور اصل معاملہ جو کچھ بھی تھا، اس طرح طے ہو جائیں کہ طرفین کو کچھ عذر نہ ہو، ریاست کے انتظام میں سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے یہ کمال نواب محسن الملک کا خاص حصہ تھا، ان کا ذہن ایسا رسا، ان کی طبیعت ایسی حاضر، ان کے اوسان ایسے بجا اور معاملات وواقعات پر ایسا عبور تھا کہ بڑے بڑے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سلجھا دیتے تھے۔ وہ اگر ٹرکی یا کسی اور سلطنت کے منسٹر ہوتے تو یقیناً دنیا میں بڑا نام پیدا کرتے۔ بڑے بڑے ان کا لوہا مان گئے تھے۔

یوں تو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نواب صاحب مرحوم کے احسانات حیدرآباد اور اہل حیدرآباد پر بے شمار تھے۔ لیکن ریاست کے نظم ونسق میں چند چیزیں خاص ان کی یادگار ہیں۔ مثلاً ریاست کا بجٹ نواب صاحب نے مرتب کیا اور یہ مصر کے بجٹ کے نمونہ بجٹ پر تھا جو وہاں انگریزی نگرانی کے بعد پہلی بار تیار ہوا تھا۔ بندوبست کا محکمہ بھی انہیں کا قائم کیا ہوا ہے جس نے اراضی کی پیمائش کا کام کیا اس کے علاوہ فنانس اور مالگزاری میں بہت سی اصلاحیں کیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں

یہ ان کے سوانح نویس کا کام ہے۔

حیدرآباد میں بڑے بڑے لوگ آئے اور گئے لیکن اب تک کسی کو وہ عام مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل نہیں ہوئی جو نواب محسن الملک کو ہوئی۔ ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر بڑے اور صاحبِ اقتدار آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار یا منصب سے محروم ہو جاتا ہے، نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدرآباد میں کہرام مچ گیا تھا۔ اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سیکڑوں آدمی جن میں امیر، غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا؟

جس زمانے میں نواب صاحب پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا، مسلمانوں میں مذہبی جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں سے شاید ایک یہ بھی تھا کہ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مسلمان دولت و اقبال، جاہ و ثروت سب کچھ کھو چکے تھے، ایک مذہب رہ گیا تھا اس لئے یہ انھیں اور بھی عزیز ہو گیا تھا، ذرا سی بدگمانی پر بھی ان کے جذبات بھڑک اٹھتے تھے۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا مسلمان مصنف یا ادیب ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو یہاں تک کہ وہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے ہیں اور اپنے خیال میں بدمذہب اور بدعقیدہ سمجھتے تھے ان کا اوڑھنا بچھونا بھی مذہب تھا، سرسید تو خیر ان کے مرشد ہی تھے ان کے حلقے کے دوسرے رکن بھی مثلاً نواب محسن الملک، حالی، مولوی مشتاق حسین، شبلی، چراغ علی، نذیر احمد وغیرہم خواہ کچھ بھی لکھتے، لیکن تان مذہب ہی پر ٹوٹتی تھی۔ نواب صاحب مرحوم کو ابتدا سے مذہبی لگاؤ تھا پہلے وہ میلاد پڑھتے اور وعظ کہتے تھے۔ نیچری ہونے پر لکچر دیئے اور مضامین لکھنے لگے۔ لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب سے ہوتا تھا۔ ان کی ایک ہی تصنیف ہے جو خالص مذہبی ہے ورنہ اس کے سوا ان کی جتنی تحریریں ہیں وہ یا تو تعلیمی ہیں یا معاشرتی یا علمی ہیں لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے اسلام یا مسلمانوں سے ہے گو وہ اردو کے اعلیٰ درجہ کے ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریریں ادبیت کی شان ضرور پائی

لہ افسوس ہے کہ مؤلف اس دشوار راستے کو طے نہ کر سکا۔

جاتی ہے۔ روانی، فصاحت، تسلسل بیان ان کے کلام میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے، اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا کر سنتے تھے اور ترجمہ کرا کر مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے مضامین میں مغربی خیالات کی ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔

تقریر کے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے، آواز میں شیرینی اور دلکشی تھی، اکثر لوگ جو اُن سے ملنے یا کسی معاملے میں گفتگو کرنے آتے تو ان کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔ ان کی خوش بیانی ایسی تھی کہ اکثر اوقات مخالف بھی مان جاتے تھے۔ دکن میں رہتے رہتے اور بعض امراض کی وجہ سے بھی وہ شدید موسم برداشت نہیں کر سکتے تھے، ایسے زمانے میں وہ بمبئی چلے آتے تھے، بدرالدین طیب جی، سرسید کے مشن اور علی گڑھ کالج کے بہت مخالف تھے، ایک دن نواب صاحب نے بدرالدین طیب جی سے ایسی فصیح اور پُرزور تقریر کی کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور تھوڑی سی دیر میں ان کی دیرینہ مخالفت کو ہمدردی سے بدل دیا، اور ایک گراں قدر عطیہ کالج کے لئے ان سے وصول کر لیا۔ بمبئی میں جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس کے صدر بھی بدرالدین طیب جی ہوئے۔ بڑے بڑے جلسوں میں جب معاملہ بگڑنے لگتا اور یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا کہ کہیں جلسہ درہم برہم نہ نہ ہو جائے تو اس وقت نواب صاحب کی خوش بیانی، فصاحت اور ظرافت جادو کا کام کر جاتی تھی۔ اور منغض اور مکدر چہرے بشاش اور شگفتہ ہو جاتے تھے۔ ان کی باتوں اور تقریروں میں ظرافت کی چاشنی بڑا مزہ دیتی تھی۔ باتوں میں ظرافت کبھی کبھی شوخی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

دوسروں سے کام لینے میں انہیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح سے ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے اپنے ملازموں سے بھی اور ماتحتوں سے بھی ان کا حسنِ سلوک ایسا تھا کہ وہ ان کی فرمائشوں کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے ان کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔

آدمی کو پہچاننے میں انہیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں وہ آدمی کو پوری طرح طرح بھانپ لیتے تھے۔ ان کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں ہے۔ اس میں بدوں کا بھی حصہ ہے اور شاید دنیا کی بہت کچھ رونق ان ہی کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے مدبرین اور سیاست دانوں کو طرح طرح کی ضرورتیں پیش آتی ہیں اور قسم قسم کے

لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کبھی ایسا وقت آپڑتا ہے کہ بدمعاشوں سے کام لئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن کمال تدبر اس میں ہے کہ ان سے کام لیا جائے لیکن انھیں قابو پانے کا موقع نہ دیا جائے نواب صاحب اس فن کے استاد تھے۔ وہ بدمعاشوں سے کام لیتے تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ وہ بدمعاش ہے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات اس کی اپنے ہاتھ میں ایسی رکھتے تھے کہ وہ سر نہ اٹھا سکتا اور اسے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان پر قابو پانے کا موقع نہ ملتا تھا۔

ان کا ذوق نہایت نفیس اور پاکیزہ تھا، رہنے، سہنے، کھانے پینے، پوشاک، غرض اُن کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔ جن لوگوں نے حیدرآباد میں نواب صاحب کی کوٹھی (جواب بھی کوٹھی محسن الملک کہلاتی ہے)، دیکھی تھی وہ اس کی داد دیتے سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا منشا کیا تھا اور ان کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا۔ لیکن یہ بلا آئی انہیں دنوں اور ان کی ہی بدولت، مسلمانوں کو اسراف کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ اس معاملے میں سرسید کے سب سے بڑے معتقد اور خلیفہ نواب محسن الملک تھے، ان کی دیکھا دیکھی دوسروں پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا۔ ان بزرگوں نے ہر چند لباس کی "تراش و خراش" مکانوں کی سجاوٹ اور بود و باش کے طریقوں میں انگریزوں کی تقلید کی، لیکن کھانا ان کا وہی ہندوستانی رہا، اسے نہ بدل سکے، یہ چٹخارے انگریزی کھانوں میں کہاں؟ نواب صاحب کھانے کے بڑے شوقین تھے اور بہت نفیس اور عمدہ کھانے کھاتے تھے۔ ان کے کھانے بڑے مرغن ہوتے تھے۔ حیرت اس بات کی تھی کہ ایسے کھانے بغیر کسی ورزش وغیرہ کے وہ کیوں کر ہضم کر لیتے تھے۔ یہی حال نواب عماد الملک مرحوم کا تھا۔ انھیں بھی کھانے کا بہت شوق تھا۔ یہ لوگ کھانے کے عیب و ہنر کو بھی خوب پرکھتے تھے۔ اسی شوق کی بدولت وہ باورچیوں کی بڑی نازبرداری کرتے تھے۔ ان کا باورچی جہاں گیر تھا۔ یہ بھی اٹاوہ کا تھا، پہلے اس کا باپ یہ کام کرتا تھا، وہ ضعیف ہو گیا تو جہاں گیر اس کی جگہ آ گیا۔ خوب کھانا پکاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاص مزہ تھا۔ مگر بڑا ہی گستاخ اور بدمزاج تھا۔ ایک دن اس نے گستاخانہ اور نالائم کلمات نواب صاحب سے کہے۔ نواب صاحب خفا ہو کر اوپر چلے گئے۔ تیسرے پہر کو جب وہ نیچے آئے تو ان کے ایک نیازمند نے عرض کیا "کیا افسوس کی بات ہے! ایسے کھانے سے تو فاقہ بہتر ہے"

فرمانے لگے "ارے میاں تم کیا جانو یہ گالیاں نہ تھیں چٹنی تھی۔"

ایک روز نہ معلوم کیا بات ہوئی وہ خفا ہو کر چل دیا۔ اب نواب صاحب سے کھانا نہیں کھایا جاتا بیگم صاحب نے طرح طرح کے کھانے پکائے مگر جہانگیر کی بات کہاں۔ بمبئی سے غدار شہر میں ایک سے ایک بڑھ کر ہوٹل اور ریستوران، مگر کہیں کا کھانا پسند نہ آیا۔ آخر روپے کا منی آرڈر تار پر بھجوایا اور جہاں گیر کو بلوایا۔ تب لقمہ حلق سے اترا کھانے کا شوق ہو تو ایسا ہو۔

بمبئی ہی کا ذکر ہے کہ ایک باورچی نواب صاحب کا نام سن کر حاضر ہوا، نواب صاحب نے پوچھا۔ کیا کیا پکانا جانتے ہو، کہنے لگا چپاتی اور قورمہ۔ نواب صاحب نے کہا بس، تو کیا جواب دیتا ہے کہ اصل کھانا تو یہی ہے، باقی سب نوابوں کے نخرے ہیں۔

نواب صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اخبارات اور اردو، فارسی، عربی کی کتابیں برابر پڑھتے رہتے تھے۔ انگریزی کے اخبارات اور مضامین بھی پڑھوا کر سنتے تھے۔ انگریزی کی ایسی کتابیں جو ان کے مذاق کی ہوتی تھیں ان کا ترجمہ کرا کے پڑھتے اور بحث کرتے تھے، ان کے کتب خانے یں فارسی، عربی اور انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں تھیں۔

سرسید کی وفات کے قریب زمانہ ہی میں اردو کی مخالفت کا آغاز ہو گیا تھا اگرچہ سرسید کی حالت اس وقت نازک تھی تو بھی اس جواں ہمت بڈھے نے اس کے متعلق لکھا پڑھی شروع کر دی تھی۔ محسن الملک کے زمانے میں اس مخالفت نے اور زور پکڑا، اردو کی حفاظت اور حمایت کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی جس کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے بڑی زبردست اور پُر جوش تقریر کی۔ جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا اور جوش کی ایک لہر پھیل گئی۔ سرانٹونی میکڈانل اس وقت لفٹنٹ گورنر تھے وہ ہندی کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ اس نے کچھ ایسی دھمکی دی کہ نواب صاحب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا اور انجمن ٹوٹ کے رہ گئی ان کی یہ کمزوری نہایت قابل افسوس ہے۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اگر انھوں نے اس پر اصرار کیا تو انھیں کالج کی سکریٹری شپ سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ کالج کی حالت اس وقت بہت نازک تھی۔ اس لئے مصلحت اس میں سمجھی کہ اردو کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں، تاہم ان کی یہ کارروائی بے اثر نہ رہی۔

نواب محسن الملک اسی شاہراہ پر گامزن رہے جس کی داغ بیل سرسید ڈال گئے تھے۔ سید کے بعد محسن الملک نے ان کے کام کو جس طرح سنبھالا، نبھایا، اور بڑھایا یہ انہیں کا کام تھا۔ ان کے بعد کوئی ان کی یادگار بنائے یا نہ بنائے محسن الملک کا کام ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

(از تذکرۂ محسن)

مولانا محمد علی مرحوم

۱۹۳۲ء

ہندوستانِ جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے مولانا محمد علی مرحوم عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت وشان لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے۔

وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجہ کا مقرر تھا، لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکّا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور ہمکاروں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتا تھا اور طرح طرح کے سلوک کرتا تھا لیکن جب بگڑتا تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا، اس وقت اسے نہ کسی کی عزت و آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اسی لئے وہ اپنے ہمکاروں سے نباہ نہ سکا اور وہ لوگ جنھیں وہ چن چن کر لایا تھا آخر کار ایک ایک کرکے الگ ہو گئے۔ یوں تو ایک مدت تک وہ عزیز مذہب سے بیگانہ رہا اور جب ادھر جھکا تو ایسا کہ

بڑے۔ بڑے جگادھری مولوی اور کٹر ملّا بھی اُس کے سامنے ہیچ تھے۔ وہ جب کبھی کسی کام کو اٹھاتا تو بڑی شان شکوہ سے اٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا لیکن تکمیل کو پہنچانا اس کی طبیعت میں ہی نہیں تھا۔ "کامریڈ" کس شان سے نکلا۔ قدر بھی اس کی وہ ہوئی جو شاید ہی کسی اخبار کی ہوئی ہو۔ اپنے پرائے سب اسے آنکھوں پر رکھتے تھے لیکن جو اس کا حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ مسلم نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی بنیاد جس زور و شور اور شدّومد کے ساتھ ڈالی گئی اس کا حیرت انگیز منظر اب تک ہماری نظروں کے سامنے ہے، اس وقت قومیت اور آزادی کی لَو انتہائی نقطے تک پہنچ گئی تھی۔ اسی ہفتے جب یونیورسٹی کے نصاب تعلیم نظم و نسق پر غور کرنے کے لئے ان کے رفقا کی کمیٹی ہوئی ہے تو وہ سماں ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ "مجذوب کی بڑ" بولتے اور سنتے آتے تھے، لیکن اس روز اپنے کانوں سُنی اور بڑی عبرت ہوئی۔ ان کے بعض سنجیدہ اور صاحب نظر رفیق جو اس مجلس میں شریک تھے ششدر و حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور بے بسی کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ وہ اس وقت اس خیال میں مست تھے اور انھیں اس کا پورا یقین تھا، کہ کوئی دن جاتا ہے کہ ہندوستان ان کے قدموں کے تلے ہوگا اور اس کی حکومت کی باگ ان کے قوی ہاتھوں میں ہوگی۔ اس خیال سے ان کا اور ان سے زیادہ ان کے برادر بزرگ کا دماغ بہک سا گیا تھا اور جو بات اس وقت ان کے منہ سے نکلتی تھی اس میں ایک عجیب مستانہ ادا اور بے تکا پن ہوتا تھا۔ خلافت کا ذکر جتنا کم کیا جائے بہتر ہے۔ اس کا غلغلہ صورِ اسرافیل کی طرح ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا۔ اور وضیع شریف، عالم و عامی، ہندو اور مسلمان سب ہی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ سے حمیت و جوش قومی کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی تھی لیکن جو انجام ہوا وہ بے کہے سب کو معلوم ہے۔ اب یہ ایک اسم بے بلا مسمّٰی۔ سانپ نکل گیا مگر ہم ابھی تک لکیر پیٹے جا رہے ہیں۔ محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وہ اپنے کاموں کے لئے گھر بیٹھے ہزاروں لاکھوں روپیہ جمع کر سکتے تھے اور کرتے تھے، لیکن وہ اس بے دردی، بے پروائی، اور غیر ذمہ دارانہ طور پر اسے صرف کرتے تھے کہ ان کے کام بھی برباد ہو جاتے تھے۔ ہم میں (خاص کر یوپی والوں اور خصوصاً مسلمانوں میں)، اب تک زمینداری کی شان قائم ہے جو بادشاہی شان کی نقل ہے۔ ہم انتظام کرنا اور اعتدال کی شان کو ملحوظ رکھنا بالکل نہیں جانتے ہم صرف ایک ہی بات جانتے ہیں لوٹنا اور لٹانا۔

محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اس کے رفقاء اور اس کے ہمعصر اس کے سامنے بونے تھے مگر افسوس اسے اپنے اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی۔ ایک دوست جو بچپن سے اسے جانتے تھے۔ اور جنہوں نے زندگی کی ہر منزل میں اسے دیکھا اور اس کا ساتھ دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا، اس میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ لیڈری کے قابل تھا بشرطیکہ اسے اپنے نفس پر قابو ہوتا۔ وہ جس طرح بیماری میں پرہیز پر قابو نہیں رکھتا تھا اسی طرح ہر معاملے میں جوش کے وقت وہ اپنے اختیار سے باہر ہو جاتا تھا۔

محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج جس شے کے لیے ہم لڑ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام، ہماری طبیعتیں ناتربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں اس کے لئے پختہ سیرت اور اعتدالِ طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔

شیخ غلام قادر گرامی

۱۹۲۲ء

گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے یہاں شاعر کے لئے جو جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز و بے پروا۔ دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر، لاابالی۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔ پہروں عالمِ خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگناتا رہتا تھا۔ اس وقت جو دیکھتا سچ مچ دیوانہ سمجھتا۔ گھر کا حال گھر والے جانیں اور باہر والے جانیں۔ وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا۔ شعر اس جوش سے پڑھتا تھا کہ گویا شعر کے جگر میں گھسا جاتا ہے اور پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتا تھا ذوقِ سخن ایسا اچھا تھا کہ اچھا شعر سن کر وجد میں آجاتا تھا۔ صورت شکل، وضع قطع سے کبھی یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسا اچھا شاعر اور ایسا صاحبِ ذوق ہوگا اگرچہ بظاہر اکھڑ تھا مگر دل میں خلوص تھا، تواضع اس طرح کرتا تھا کہ جیسے کوئی کسی سے لڑتا ہے اور یہ اس کے عین خلوص کی علامت تھی دوستی کا سچا اور دوستوں کا قدردان تھا۔

ضد ضرور تھی لیکن وہی بچوں کی سی، منانے پر فوراً من جاتا تھا اور دوستوں کا کہنا مان لیتا تھا، لیکن سچ بات کہنے میں وہ بڑے بڑوں سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ تصنع سے دور، نہایت بے تکلف اور آشنا پرست تھا۔ وہ بہت بھولا تھا مگر بکار شعر ہوشیار اور بکار دنیا بے کار۔ اگرچہ مدتوں دوآبہ گنگ وجمن اور حیدرآباد میں رہا مگر لہجہ ٹھیٹ پنجابی تھا جو بعض وقت بڑا مزہ دیتا تھا۔ غیر لوگ آ آ کر بڑے اصرار سے اس کا کلام سنتے تھے مگر دوستوں کو وہ خود سناتا تھا، وہ بھی محظوظ ہوتے اور خود بھی محظوظ ہوتا، اگرچہ ہندی نژاد تھا مگر فارسی کا استاد تھا۔ اتنا کچھ لکھا مگر کہیں محاورۂ فارسی میں لغزش نہیں ہوئی۔ اس کا کلام اُستادانہ

تھا اور قدیم اساتذہ کی روش پر چلتا تھا اور اپنے شعر کو خوب بناتا اور سنوارتا تھا، اس کے کلام میں جوش، گرمی اور شان و شوکت پائی جاتی تھی اس نے بڑے بڑے معرکے جیتے اور بڑے بڑے استادوں کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور کہیں ہیٹا نہیں رہا۔ اس کی وفات سے ایک بڑے اُستاد کی جگہ خالی ہو گئی اور چونکہ فارسی کا رواج اٹھتا جاتا ہے اُس لئے امید نہیں کہ پھر کوئی گرامی پیدا ہو۔

حالی

۱۹۳۷ء

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم تھا مولانا حالی اس زمانے میں یونین کی پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس سال تعطیلوں کے زمانہ میں وطن نہیں گیا تھا بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں "حیات جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ "یادگار غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے، میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لئے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں عزیز مہمان فرمانے لگے کہ ملنے سے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنھوں نے "مسدس" لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی بلدۂ حیدرآباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کئے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے، ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیں

کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدہ میں کھڑے دیکھ رہے تھے اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ کر کے سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پُرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رُخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا، وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا"۔ اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے، کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی۔ وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے۔ "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں"۔ اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری درد دلی۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے نامور اصحاب اور اپنی قوم کے اکثر بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسا پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا، اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے یا جو اُن سے ملے ہیں وہ ضرور اس قول کی تصدیق کریں گے۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی، اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور پھر عمر بھر ان کے حسنِ اخلاق کا مداح رہتا تھا۔ ان کا رتبہ بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک بار جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے، میں اور مولوی حمید الدین مرحوم ان سے ملنے گئے تو وہ سروقد تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں، فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

اس سے بڑھ کر خاکساری کا ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں "ہمیشہ مرتبہ" لکھا، کبھی "مؤلفہ" یا "مصنفہ" کا لفظ نہیں لکھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے پردہ اٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھالیا مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد کھانا منگوایا، انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت شوقین تھے۔ پانی پت کی ملائی بہت مشہور تھی۔ ان کے لئے ملائی منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا پھر ان کے لئے پلنگ بچھوا کر بستر کرا دیا اور خود آرام کرنے کے لئے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے پڑ کر سو رہے۔ مولوی انوار احمد کہتے تھے کہ رات کے بارہ ایک بجے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رضائی کو آہستہ آہستہ چھو رہا ہے۔ انھوں نے چونک کر پوچھا کون ؟ مولوی صاحب نے کہا، میں ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اوڑھا رہا تھا۔ انوار احمد صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر ان کی اس شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

مہمان کے آنے سے (اور اکثر ایسا ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اس کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے۔ باوجودیکہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروت ایسے تھے کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مند ان کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم وملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش

کرتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انھیں بہت رنج و افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے بھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

ہندی اردو کا جھگڑا ان کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا، اور اس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی، لیکن باوجود اس کے کہ انھوں نے عمر بھر اردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اردو کا درجہ بہت بلند کر دیا۔ وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے، چنانچہ "خمانۂ جاوید" کے تبصرے میں لکھتے ہیں:۔

آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی سے جو اختلاف ہندو اور مسلمانوں میں اردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی انسداد ہو سکتی ہے تو اس طریقے سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو در حقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے اسی طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے ہردلعزیز سیر نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک متنازع فیہ زبان کو مقبولِ فریقین بنائیں جیسی کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہلِ دہلی کی زبان تھی۔ مذکورہ بالا اختلاف کے متعلق جو تعصب اور ناگوازی کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے اس قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت

میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح، زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابل التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلۂ سنسکرت کے نہایت سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ جو اُردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا دارومدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی فارسی سے اس کو اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسماء اس میں کثرت کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنیٰ نہیں ہو سکتی، برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ "دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر"

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور بعض اردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے، اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی فارسی سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے، اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسماء کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بنا

فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے نیز اردو زبان میں بڑا حصہ اسماء کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسہ پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔"

ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرتے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گویا اسی موقع کے لئے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ اردو ادب میں داخل کئے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کسی ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا، لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادیب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

نام و نمود چھو کر نہیں گیا تھا۔ ورنہ شہرت وہ بدبلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی، بلکہ شیوہ ہو گئی ہے۔ وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کر کے اپنی فضیلت جتانا اور اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے، مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ مثلاً۔

گرچہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

یا

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اس سے بے خبر شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

ان کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجہ کا تھا جیسا کہ "حیات سعدی" "یادگار غالب" اور مقدمہ شعر و شاعری" سے ظاہر ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آپڑتی تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہوگیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر سے اس لئے فرمائش کرتا ہے کہ اسے بھی اپنا کلام سنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے بعد مخاطب بھی اس سے یہی فرمائش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس لئے فرمائش کرتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے (بعض شاعر تو اس کے لئے بیچین رہتے ہیں)، لیکن بعض لوگ سچے دل سے اس بات کے آرزو مند ہوتے ہیں کہ کسی شاعر کا کلام اس کی زبان سے سنیں۔ لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے، وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کردیتے تھے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا اس میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدرآباد میں تھا ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی چند اور احباب کو بھی بلایا، چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سنائیے۔ مولانا نے وہی حافظہ کا عذر کیا ہرچند لوگوں نے کہا کہ جو کچھ بھی ہو یاد وہ فرمائیے مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی، وہ چپکے سے اٹھے اور کہیں سے دیوانِ حالی لے آئے اور لاکے سامنے رکھ دیا۔ اب مجبور ہوئے کہ کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا آخر انہوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع تھا:۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جاکر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور سے گاکے پڑھتے ہیں، ان کا ذکر نہیں لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور جسم سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے

طور سے پڑھتے تھے۔ البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔ انھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لئے مولوی وحید الدین سلیمؔ صاحب کو دی جو بہت بلند آواز مقرر، پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک ہی بند پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا۔ نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی۔ ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسید تو اس زمانے میں خیر موردِ لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس و ناکس ان پر منہ آتا تھا۔ لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار پڑی وہ حالی تھے۔ ایک تو ہر وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور "مقدمۂ شعر و شاعری" نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارروائی انھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی صدا آنے لگی۔ "اودھ پنچ" میں ایک طویل سلسلۂ مضامین "مقدمہ" کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی، جن مضامین کے عنوان

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجئے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی، مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے۔

ع غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب و غریب مادّہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے تھے۔ جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں ان کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے۔ یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ جوش میں آکر آدمی سررشتۂ اعتدال کھو بیٹھتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔

ان کا ایک نواسہ تھا، ماں اس کی بیوہ تھی اور اس کا ایک ہی لڑکا تھا۔ اکلوتا لڑکا بڑا لاڈلا ہوتا ہے اس پر ایک آفت یہ تھی کہ مرگی کی بیماری میں مبتلا تھا اس لئے ہر طرح اس کی خاطر اور رضا جوئی منظور تھی۔ وہ مولانا کو بہت دق کرتا مگر وہ اُف تک نہ کرتے۔ وہ اینڈے بینڈے سوالات کرتا۔ یہ بڑے تحمل سے جواب دیتے۔ وہ فضول فرمائشیں کرتا۔ یہ اس کی تعمیل کرتے۔ وہ خفا ہوتا اور بگڑتا، یہ اسکی دلدہی کرتے۔ وہ روٹھ جاتا۔ یہ اسے مناتے وہ لڑکر گھر سے بھاگ جاتا یہ اسے ڈھونڈتے پھرتے۔ پانی پت سے کہیں باہر جاتے تو وہ انہیں دھمکی آمیز خط لکھتا۔ یہ شفقت آمیز خط لکھتے اور سمجھاتے بجھاتے۔ کچھ اس کی ڈکھیا ماں کا پاس، وہ سب سے زیادہ اس پر شفقت فرماتے اور اس کی ہٹ، خفگی، روٹھنے مچلنے کو سہتے اور کبھی آزردگی یا بیزاری کا اظہار نہ کرتے۔ اگرچہ جوان ہو گیا تھا مگر مزاج اس کا بچوں کا تھا۔ سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار اس نے مولانا کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گر پڑے۔ کہیں خواجہ سجاد حسین صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ بہت برہم ہوئے اور شاید اس کے ایک تھپڑ مار دیا۔ مولوی صاحب اس پر سخت ناراض ہوئے اور خواجہ صاحب سے بات چیت موقوف کر دی اور جب تک انہوں نے اس لڑکے سے معافی نہیں مانگ لی، ان سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی، جس حالت پر تھے اس پر قانع تھے، اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انہیں عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انہوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کئے جس کے تخمیناً پچھتر حالی ہوتے ہیں۔ ایک مدت تک پچھتر ہی ملتے رہے۔ بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست

حیدر آباد سے معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں، وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا، مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا وہ اس کے لئے بہت شکر گذار تھے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصانیف مال یغما تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیرچشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے۔ خصوصاً ایسے شخص کے لئے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

مروّت کے پتلے تھے۔ جب تک خاص مجبوری نہ ہو کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ وقت بے وقت لوگ آجاتے اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے وہ بیٹھے سُنا کرتے لیکن محض دل آزاری کے خیال سے یہ نہ ہوتا کہ خود اُٹھ کر چلے جاتے یا کنایتاً اشارۃً کوئی ایسی بات کہتے کہ لوگ اُٹھ جاتے حیدرآباد کے قیام میں میں نے اس کا خوب تماشا دیکھا۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدر آباد تشریف لائے، سرسید کی برسی کا جلسہ بھی انہیں کی موجودگی میں ہوا۔ ان سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لئے سرسید کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عماد الملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لئے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل تھا۔ پڑھتے پڑھتے شام ہو گئی، اس لئے آخری حصہ چھوڑ دیا قیامگاہ پر واپس آکر فرمانے لگے میرا گلا بالکل خشک ہو گیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، اچھا ہوا جو اندھیرا ہو گیا ورنہ اس سے آگے ایک حرف نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا اسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے "پیسہ" اخبار جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی "ہمدرد" اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی

اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو سمجھاتے۔ ان کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہمعصر اس بات سے ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بڑی فیاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے کتنا دل بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض وقت چھیڑ چھیڑ کر اور کُرید کُرید کر دیکھا اور اُن کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف ہیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم ان کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے اُن میں دونوں نے طبع آزمائی کی، "برکھارت" "حبِّ وطن"، "نشاطِ اُمید" اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبعِ نازک پر گراں گزرا، اس وقت سے ان کا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثال نثار ہیں مگر شعر کے کوچہ میں ان کا قدم نہیں اٹھتا لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجئے کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں۔

> "۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔"

بات میں بات نکل آتی ہے جب "حیاتِ جاوید" شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے تھے۔ ایک میرے لئے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب جو اس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں

پیش کی۔ لنگر یہ تو رہا ایک طرف دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے" وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سُن کر دم بخود رہ گیا یوں بھی کچھ کہنا سوءِ ادب تھا لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنیئے۔ قیامِ حیدر آباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ "دکن ریویو" نکالتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے چپ چاپ سنا کئے۔ مولانا نے یہ فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہو گی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

خود مولانا پر بہت سی تنقیدیں لکھی گئیں اور نکتہ چینیاں کی گئیں لیکن انھوں نے کبھی اس کا بُرا نہ مانا۔ مولانا حسرت موہانی کا واقعہ جو مجھ سے مولوی سلیم مرحوم نے بیان فرمایا اور اب شیخ اسمٰعیل صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے بہت ہی پُر لطف ہے۔

۱۹۰۳ء میں جب مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے علی گڑھ سے "اردوئے معلّٰی" جاری کیا تو جدید شاعری کے اس مجدّدِ اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ "اردوئے معلّٰی" باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناخوشی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے۔ اور حسبِ معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کو ساتھ لئے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے چندے ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور "اردوئے معلّٰی" کے

دو تین پرچے اٹھا لائے۔

حسرت اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچہ کے ورق الٹنا شروع کئے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور "اردوئے معلٰی" کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ! خوب لکھا کہہ کر داد دیتے تھے، حالی بھی ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے۔ "اے مولانا! یہ دیکھیے، آپ کی نسبت کیا لکھا ہے"، اور کچھ اس قسم کے الفاظ شروع کئے "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلد اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے"

فرشتہ خصلت حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اور یہ عیب میں داخل نہیں۔"

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ "حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟" جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔"

(رسالہ زمانہ ماہ دسمبر ۱۹۰۸ء جلد ۱۱ نمبر ۶ صفحہ ۲۹۸ تا ۲۹۹)

(ماخوذ از تذکرۂ حالی صفحہ ۱۹۵ تا ۱۹۸)

مولانا حالی انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے، ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہو سکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا کہ وہ سمجھتے تھے اس وقت بہت سے انگریز تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔ اور جو یہ سمجھتے تھے وہ کر کے دکھایا آج سینکڑوں تعلیمیافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشر عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح بالکل خیالی شخص تھے۔ بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ آدمی متفکر بھی ہو اور عملی بھی، ایسا شاذ ہوتا ہے، تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انھوں نے اپنے وطن پانی پت

میں مدرسہ قائم کیا جواب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک پبلک اورینٹل لائبریری قائم کی جو پانی پت میں سب سے بلند اور پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاصکر عورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے، انھوں نے ہمیشہ حمایت کی "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" یہ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں، دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے، کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا، مگر وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔ لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبار کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے، کہ جب ان کے نام حیدر آباد میں ایک روز "اولڈ بوائے" آیا تو اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخرا پن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انھیں علی گڑھ کے طلبار سے اس سے اعلیٰ توقع تھی۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجہ کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ خود کوئی ڈرامہ لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور رہیں۔

آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں۔ ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد پر ہوا تھا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی ہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے۔ پانی بہت لطیف ہے، اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پُر فضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آیئے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخلِ اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آکر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب رضامند نہ تھے۔ عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے، ضعیفی کا عالم ہے۔ طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلافِ مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو دو ایک روز کے لیے پانی پت بھی چلے آنا، اس وقت میں تمھارے ساتھ ہولوں گا، پھر کوئی چوں وچرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو وہ بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی۔ اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی بد معاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ جب ملتے تو اسی شفقت و عنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس کی بدسلوکی اور بد معاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔ اسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسن سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں

کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں ان کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں۔ ورنہ یوں دنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو دنیا کبھی اچھّوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحب علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں۔

نام دیو — مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہوگیا ہے۔ سچائی، نیکی، حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اُونچی ذات والوں میں ؎

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اُس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا لکھتے لکھتے کبھی نظر اُٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً گیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اُس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذّت آنے لگے بے مزہ کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اُسے دیکھا کرتا۔ مگر اُسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اُس کے پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچّوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک

ایک پودے کے پاس بیٹھتا، اُن کو پیار کرتا، جُھک جُھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُن سے چُپکے چُپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ اُن کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اُسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اُسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اُسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اُسے بڑی مہارت تھی۔ دُور دُور سے لوگ اُس کے پاس بچّوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے اُن کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گانو والے بھی اُسے علاج کے لیے بُلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا بُہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صِلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باؤلیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مُرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اُٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بُجھاتا جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اُس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اِس بے مثل کارگذاری پر اُسے انعام دینا چاہا تو اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچّوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب وہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظمِ تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی تربیت و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سُنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دُور دُور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر وتفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اُسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ اُن کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اُس نے نہ فنِ باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اُس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دُھن تھی۔ کام سے سچّا لگاؤ تھا اور اسی میں اُس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام دھا کا رہا۔ دوسرے

مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اُس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلّڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اُسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جُھک کے ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اُسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اُسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔